مولانا وحید الدین خاں

فہرست

تمہید 7

مارکسزم کیا ہے؟ 9

مارکسزم کی نظریاتی ناکامی 18

—تاریخی مادیت کا فریب 27

—تاریخی ناگزیریت 37

—طبقاتی نظریہ 39

—متضاد باتیں 46

—سماجی ارتقاء کا نظریہ 49

توجیہہ 56

مارکس کے حل پر اصولی تنقید 59

—سیاسی جمہوریت کے بعد معاشی جمہوریت 59

—اجرتی غلامی کا نظام 66

—اجتماعی ملکیت کا نظام انفرادی لوٹ کی بدترین شکل 69

—اجارہ داری کیوں؟ 72

—فریب پر حماقت کا اضافہ 74

مارکسی حل کا تجربہ 80

—اشتراکیت کا اقبال جرم 80

—مزدور طبقہ کا کردار سرمایہ دار طبقہ کے کردار سے مختلف نہیں 91

—سیاسی جبر 95

— کمیونزم کی ناگزیریت 101

—اشتراکیت کا جھوٹ ظلم کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتا 104

—معاشی خوشحالی کی حقیقت 107

—بنیادی اصول 110

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

''اشتراکیوں کے نظریہ کو ایک جملہ میں یوں ادا کر سکتے ہیں ''ذاتی ملکیت کا خاتمہ''۔ یہ مارکس اور انگلس کے مشہور کمیونسٹ مینی فسٹو کا ایک فقرہ ہے۔ یہ ذاتی ملکیت کا خاتمہ یا دوسرے لفظوں میں ''سماجی ملکیت کا نظام'' معمولی اختلاف کے ساتھ اس زمانے میں عام طور پر انسان کے معاشی مسائل کا حل سمجھا جانے لگا ہے۔ یہی وہ نظریہ ہے جو انارکزم، سنڈیکلزم، کمیونزم اور گلڈ سوشلزم وغیرہ مختلف ناموں سے ظاہر ہوا ہے۔ اگرچہ ان نظریات کے درمیان مختلف مسائل میں بہت سے اختلافات ہیں اور اکثر اوقات یہ ایک دوسرے کی تردید و تکفیر بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر جو بات سب میں مشترک ہے وہ یہ کہ یہ تمام نظریے اجتماعی ملکیت کے نظام پر یقین رکھتے ہیں اور زندگی کے بارے میں اس فلسفہ کو کسی نہ کسی شکل میں تسلیم کرتے ہیں جو مارکس نے اپنے نظریے کی تائید میں مرتب کیا تھا۔ یہ مختلف جماعتیں نہیں ہیں، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں یہ ایک تحریک کے مختلف فرقے ہیں جو بعض جزوی یا عملی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ گئے ہیں۔ میں زیادہ تر مارکسزم کو سامنے رکھ کر گفتگو کروں گا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ کسی دوسرے مدرسۂ فکر کے اصول و قواعد اس طرح سے باقاعدہ طور پر منظّم اور متعین نہیں، جس طرح مارکسزم کے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اشتراکی افکار جو مارکس سے پہلے یورپ میں پھیلے ہوئے تھے، مارکسزم ان سب کا خلاصہ اور اس کے بعد جو افکار پیدا ہوئے، ان سب کی اصل ہے۔ اس لئے مارکسزم پر جو گفتگو ہوگی۔ وہ بڑی حد تک ماضی اور حال کے دوسرے سوشلسٹ نظریات پر بھی اسی طرح چسپاں ہوگی جس طرح وہ خود مارکس کی تعلیمات پر چسپاں ہوتی ہے۔

مارکس نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ لینن کے الفاظ ہیں: ''اس نے ان سوالوں کے جوابات

فراہم کیے ہیں جن پر اس کے پہلے ممتاز لوگوں نے دماغ سوزی کی تھی ۔ مارکس کی تعلیمات ـــــ "فلسفہ ٔمعاشیات اور سوشلزم کے بڑے بڑے نمائندوں کی تعلیمات کا براہِ راست نتیجہ اور اسی سلسلہ کی اگلی کڑی ہیں[1]۔ انیسویں صدی میں جرمن فلسفہ انگریزی علم معاشیات اور فرانسیسی سوشلزم کے روپ میں یورپ کے مادی ذہن نے جو چیزیں تخلیق کی تھیں مارکس نے ان کو نئی ترتیب اور مزید قوت استدلال کے ساتھ اکٹھا کر دیا ہے جس میں اس مظلوم طبقہ کی چیخ بھی شامل ہے جس کو یورپ کے صنعتی انقلاب نے جنم دیا تھا"۔

---

[1] لینن، سلکٹیڈ ورکس، جلد اول، صفحہ ۵۹ (ماسکو ۱۹۴۷)

مارکسزم کیا ہے

مارکس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے تاریخ کو وہ کچھ بخشا ہے جو ڈارون نے علم الحیات کو۔ مارکس اس خیال کو دوسرے انداز سے ظاہر کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے تاریخ کو سائنس کی صورت دی ہے۔ ایک ایسی سائنس جس کے اپنے قوانین ہیں اور جس کے مطابق ماضی اور مستقبل دونوں کی تشریح کی جاسکتی ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہوگی، دنیا میں جو کچھ ہے یا ہر آن جو کچھ پیش آرہا ہے ان کو اگر ''دو واقعات'' کے لفظ سے تعبیر کیا جائے تو یہ دو قسم کے واقعات ہوں گے۔ ایک وہ جو مادی دنیا سے متعلق ہیں اور دوسرے وہ جو انسانی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایک دنیا وہ ہے جس کے تمام واقعات اپنے قوانین کے تحت خود بخود وجود میں آتے ہیں اور دوسری دنیا وہ جس کے واقعات کو بظاہر ہر کسی کا شعور اور ارادہ وجود میں لاتا ہے۔ پہلی دنیا میں ایٹم کے ناقابل مشاہدہ ذرّات سے لے کر سیاروں کی عظیم کائنات تک ہر چیز ایک قانون میں بندھی ہوتی ہے اور اسی کے مطابق کوئی شکل اختیار کرتی ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے اسباب خود اس چیز کے اندر پہلے سے کام کر رہے تھے جس کے اندر کوئی واقعہ ظاہر ہوا ہے۔ اسی طرح جو کچھ آئندہ ہوگا وہ بھی اپنے سابقہ حالات کا نتیجہ ہوگا جس کے اسباب پہلے سے اس کے وجود کے لیے کام کر رہے ہوں گے۔ سیاّروں کی گردش کے نظام کو معلوم کرنے کے بعد ہم یہ بتاسکتے ہیں کہ کوئی ستارہ ایک سو سال پہلے کہاں تھا اور آئندہ ایک سو سال بعد کہاں ہوگا۔ لوہے کی خاصیت دریافت کر کے ہم اس کے ذریعہ بڑی بڑی مشینیں اور آلات بنا سکتے ہیں۔ پانی کے قانون کو معلوم کر کے ہم اسے بھاپ کی طاقت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان جس کائنات کو اپنے سامنے پاتا ہے، وہ بذات خود قائم ہے۔ اس کے اپنے قوانین ہیں، جن کے تحت اس کے سارے واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ اس میں انسانی کوششوں سے کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ انسان کے لیے صرف یہ ممکن ہے کہ کائنات کے قوانین کو

معلوم کر کے انھیں استعمال کرے، ان سے سازگاری پیدا کر کے اپنے لیے انھیں زیادہ سے زیادہ مفید بنائے۔ اس طرح طبعی دنیا میں انسان نے جو نئی باتیں معلوم کی ہیں وہ دراصل نئی نہیں ہیں بلکہ وہی ہیں جو پہلے سے موجود تھیں۔ انسان نے انھیں ایجاد نہیں کیا بلکہ صرف دریافت کیا ہے۔ ان کو ایجاد کے بجائے انکشاف کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ یہی بات ہے جس کو فریڈرش انگلس نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے:

''کائنات کا مادی تصور یہ ہے کہ فطرت کو کسی خارجی آمیزش کے بغیر ٹھیک ویسا ہی سمجھا جائے جیسی کہ وہ ہے[1]''

یہ تو مادی دنیا کی تشریح ہوئی۔ اب سوال یہ تھا کہ عالم انسانی کی حقیقت کیا ہے۔ وہ کون سی طاقت ہے جو زندگی کی سرگرمیوں کو وجود میں لاتی ہے۔ تاریخ کے اتار چڑھاؤ کن اسباب کے تحت پیش آتے ہیں، انسان کے ہاتھوں مسلسل جو واقعات رونما ہو رہے ہیں ان کا محرّک اصلی کون ہے، کیا ان کی بھی کوئی اندرونی منطق ہے اور وہ خود اپنے ذاتی قوانین کے تحت واقع ہوتے ہیں یا انسان ان کا خالق ہے۔ دوسرے لفظوں میں کیا انسان کی کارکردگی کی بھی وہی نوعیت ہے جو مادی دنیا کی کارکردگی کی ہے۔

مادی دنیا اور انسانی سماج دونوں ایک ہی نظام کے تحت حرکت کرتے ہیں، یا دونوں کا الگ الگ اصول ہے۔ اس طرح یہ سوال بالآخر روح اور مادہ کا سوال بن گیا۔ یعنی یہ کہ سماجی حالات سے باہر کا کوئی محرک ـــــ انسان کا ذہن یا کسی بالاتر قوت کا ارادہ ــــ ان واقعات کو وجود میں لاتا ہے یا مادی دنیا کی طرح وہ خود اپنے لگے بندھے قانون کے تحت وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ انگلس کے بقول:

''فلسفہ کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ فکر اور ہستی یا روح اور فطرت میں کیا باہمی تعلق ہے، اسی سوال کے جواب کی بنا پر فلسفیوں کے دو بڑے گروہ بن گئے ہیں۔ جن لوگوں نے دعویٰ کیا کہ روح فطرت پر مقدم ہے، وہ عینیت پسند کہلاتے ہیں اور جو لوگ فطرت کو اصل شمار کرتے ہیں وہ مادّیت پسند ہیں۔ ان دونوں گروہوں کی مختلف شاخیں ہیں[2]۔''

مارکس کا یہ کہنا کہ اس نے تاریخ کو سائنس کی صورت دی ہے، دراصل اسی سوال کا ایک جواب

---

[1] کارل مارکس، سلکٹڈ ورکس جلد اول، صفحہ ۶۷، (ماسکو ۱۹۴۶)

[2] کارل مارکس، سلکٹڈ ورکس، جلد اول، صفحہ ۶۷

ہے۔ مارکس نے اس مسئلہ پر غور کیا کہ ہمارا موجودہ سماج اس حالت پر کیوں کر پہنچ گیا۔ اس میں تبدیلی کیوں ہوتی رہتی ہے اور آئندہ اس میں کس قسم کی تبدیلی کا امکان ہے۔ وہ اپنے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ جس طرح بیرونی دنیا کے واقعات اتفاقی طور پر نہیں ہوتے، اسی طرح سماج میں بھی کوئی تبدیلی محض اتفاق سے نہیں ہوجاتی۔ اس کے پیچھے خاص اصول کارفرما ہوتے ہیں۔ جس طرح نیوٹن اور آئن سٹائن نے کائنات کی حرکت کے قوانین معلوم کرنے کی کوشش کی اور اس کے اصول مرتب کئے۔ اسی طرح مارکس نے تاریخ انسانی کا مطالعہ کر کے وہ ''سائنٹفک اصول'' دریافت کئے جو سماج کی تبدیلیوں میں کام کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہماری سوسائٹی میں جو تبدیلی ہوتی رہتی ہے وہ چند خاص اصولوں اور قوانین کی پابند ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے کائنات کی دوسری چیزیں خاص قوانین کی پابند ہیں۔ یہ دونوں قانون ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں، یہ قوانین جو ہمارے اطراف کی ساری کائنات اور ہماری سوسائٹی دونوں پر یکساں حیثیت سے صادق آتے ہیں۔'' انہی کا نام مارکسی فلسفہ یا کائنات کا مارکسی نقطۂ نظر ہے۔ دوسرے لفظوں میں مارکس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عالم مادی اور عالم انسانی دونوں ایک ہی قسم کے قانون کے پابند ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ایک کمیونسٹ مفکر کے الفاظ ہیں:

> ''تمام نیچر ایک ہے، اس لیے اس کو سمجھنے کے لیے سائنس کا اسلوب بھی ایک ہے۔ اب اس اسلوب کو خواہ چٹانوں کو سمجھنے کے لیے استعمال کیا جائے، خواہ بینکروں اور مل مالکوں کی دنیا پر اسے چسپاں کیا جائے۔ مارکس اور انگلس کی عظمت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے سائنس کے اس بنیادی اسلوب کو انسانی سماج پر بھی اسی طرح منطبق کیا جس طرح کہ ان سے پیشتر یہ جمادات، نباتات وغیرہ پر استعمال کیا جارہا تھا۔ انھوں نے تاریخی واقعات، اقتصادی مواد اور فلسفیانہ نظریوں کا جو کہ تاریخ کے دامن میں صدہا سال سے جمع ہوتے جارہے تھے ٹھیک طرح مرتب کیا، تولا، کلّیئے قائم کیے اور انسان کے باہمی تعلقات کے ان تمام قوانین کو دریافت کیا جس کے بغیر یہ سماجی زندگی ایک الجھا ہوا معمّہ نظر آتی تھی[1]۔''

اس طرح مارکس نے کہا کہ انسانی سماج کی ایک سائنس ہے جس کے اپنے قوانین ہیں اور اسی

لئے وہ ماضی اور مستقبل دونوں کی تشریح کرسکتی ہے۔ مارکس نے یہ قوانین مرتب کئے اور ان کو استعمال کر کے مستقبل کے سماج کے بارے میں بہت سی پیشین گوئیاں کرنے کی جرأت کی۔ جس طرح فلکیات کا ایک ماہر سیاروں کی گردش کے بارے میں پیشین گوئی کرتا ہے۔ میں نے یہاں ''جرأت'' کا لفظ استعمال کیا ہے کیوں کہ جو شخص ہمیں یہ بتائے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ قدرتی طور پر اس کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے کہ حالات اس کے الفاظ کو غلط نہ قرار دیں۔ وقت اس شخص کے نظریہ کے صحیح یا غلط ہونے کا امتحان ہوتا ہے جو مستقبل کے بارے میں کچھ کہنے کی جرأت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص اگر یہ اعلان کرے کہ زمین جس قانون کے تحت گردش کر رہی ہے، وہ میں نے معلوم کر لیا ہے اور اس قانون کے مطابق یہ ہوگا کہ زمین ایک سو ایک دن میں چاند سے ٹکرا جائے گی تو اس شخص کے دعوے کے غلط ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہوگی کہ ایک سو ایک دن گزرنے کے بعد بھی زمین کی گردش حسب دستور جاری رہے اور وہ چاند سے نہ ٹکرائے۔ اس طرح مارکس کا یہ نظریہ کہ زندگی کے واقعات طبعی سائنس کی طرح ایک لازمی قانون کے تحت پیش آتے ہیں، خود بخود غلط ثابت ہو جائے گا۔ اگر مستقبل کے واقعات ان پیشین گوئیوں کی تصدیق نہ کریں جو مارکس نے اپنے نظریے کے مطابق ماضی میں کی تھیں، ممکن ہے مارکس کی زندگی میں اس کے نظریے کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں فیصلہ نہ کیا جا سکتا ہو۔ مگر اب سو برس گزرنے کے بعد تو خود زمانہ ایک ایسی بنیاد ہے جس کی روشنی میں جانچ کر ایک معمولی آدمی بھی مارکس کے نظریہ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ مارکس کے اس نظریے کے تین اہم اجزاء ہیں:

اول یہ کہ جس طرح ستاروں کی گردش کا ایک قانون ہے جس کے مطابق وہ مسلسل حرکت کر رہے ہیں، اسی طرح انسانی سماج بھی ایک طے شدہ راہ پر سفر کر رہا ہے۔ مارکسزم کے نزدیک سائنس کے قوانین ـــــ چاہے وہ فطری سائنس سے متعلق ہوں یا سماجی سائنس سے ـــــ سبھی خارجی اعمال کا عکس ہیں جو انسان کی مرضی سے آزاد ہو کر اپنا کام کرتے ہیں۔ آدمی ان کو نہ تو بدل سکتا ہے اور نہ

---

[1] شیر جنگ، کارل مارکس اور اس کی تعلیمات صفحہ ۲۷

انھیں مٹا سکتا ہے، یہ عالم فطرت کے اٹل قوانین ہیں، جن میں کبھی فرق واقع نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ قائم ہیں اور ہمیشہ قائم رہیں گے۔ جس طرح انسان کی پیدائش ایک ایسے قانون طبعی کے تحت ہوتی ہے، جس پر اسے کوئی اختیار نہیں ہے۔ اسی طرح سماج کے بدلنے کے قوانین ''ناگزیر تاریخی وجوب'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پہلے جو کچھ ہوا وہی ہوسکتا تھا اور آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ انسان اپنے ارادہ سے اس میں ردّ و بدل نہیں کرسکتا۔

دوسرے یہ کہ یہ قانون لازمی طور پر ارتقاء کا قانون ہے۔ یعنی سماج کا یہ سفر محض ایک مسلسل گردش نہیں ہے بلکہ وہ ارتقائی سفر ہے جس میں ہر اگلا دور اپنے پچھلے دور سے ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ سماج کبھی پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا بلکہ ہمیشہ آگے کی طرف جاتا ہے۔ اس کا حال اس کے ماضی سے بہتر ہے اور اس کا مستقبل اس کے ماضی اور حال دونوں سے بہتر ہوگا۔

تیسرے یہ کہ انسان کی جو حیثیت مادی کائنات کے مقابلہ میں ہے۔ ٹھیک وہی حیثیت سماج کے مقابلے میں بھی ہے۔ مادی دنیا کا اپنا ایک قانون ہے جس کے مطابق، اس کے تمام مظاہر واقع ہوتے ہیں۔ انسان اس میں تبدیلی نہیں کرسکتا۔ البتہ اس کا قانون معلوم کر کے استعمال کرسکتا ہے۔ دریا کا بہاؤ طوفان لاتا ہے اور تباہی پیدا کرتا ہے۔ انسان اگر پانی کی سائنس معلوم کرلے تو وہ بند بنا کر اس سے آب پاشی کا کام لے سکتا ہے، اس سے بجلی پیدا کرسکتا ہے اور دوسرے بہت سے فائدے حاصل کرسکتا ہے۔ یہی حال انسانی سماج کا بھی ہے۔ اس کا بھی اپنا ایک قانون ہے جس کے تحت وہ حرکت کرتا ہے مگر یہ حرکت سیاروں کی حرکت کی طرح نہیں ہے جس کے مقابلہ میں انسان بالکل بے بس ہو، بلکہ دریا کے بہاؤ کی طرح ہے، جس پر آدمی قابو پاسکتا ہے اور اپنی کوشش سے اس کے رخ کو پھیر سکتا ہے۔

سماجی ارتقاء کے بارے میں مارکس کی دریافت کردہ سائنس کے یہ قوانین ہیں جن کو مارکس نے انسانی تاریخ کے واقعات پر چسپاں کیا ہے اور اس سے نتائج برآمد کرنے کی کوشش کی ہے، اب سے پہلے جو انسانی معاشرے تاریخ میں پائے گئے ہیں، مارکس نے ان کا تجزیہ کر کے بتایا کہ ان کی شکل کیا تھی اور کس طرح وہ اس کے نظریہ کی تائید کرتے ہیں اور پھر اس نظریہ کے مطابق آئندہ انسانی سماج

جوشکل اختیار کرے گا اس کی پیشین گوئی کی۔ اس نظریہ کے مطابق، اس نے کہا کہ سماجی تبدیلیوں کی تہہ میں جو اصول کام کر رہا ہے وہ جدلیات کا اصول ہے۔ یعنی انسانوں کے اندر طبقات کا پیدا ہونا اور مختلف طبقات کا باہم ٹکرانا۔ مارکسی نظریہ کے مطابق ''انسان نے اب تک جتنے معاشرے قائم کیے ہیں ان سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے۔ غلام اور آقا، امراء اور عوام، سرمایہ دار اور مزدور، مختصر یہ کہ ظالم اور مظلوم ہمیشہ سے ایک دوسرے کے خلاف باہم برسرپیکار رہے ہیں''[1] طبقات کا باہمی ٹکراؤ یہی وہ سیڑھی ہے جس پر انسانی تاریخ سفر کرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔

مارکس کے متعلق یہ بات بالکل غلط طور پر مشہور ہوگئی ہے کہ وہ مساوات کا علمبردار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف نظام استحصال کو مٹانا چاہتا ہے۔ مارکس کے نزدیک انسانیت کی تمام پچھلی تاریخ لوٹ کھسوٹ کی تاریخ ہے جس میں ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو لوٹتا رہا ہے، وہ اسی صورت حال کو ختم کرنا چاہتا ہے، اس کے نظریات جو ـــــ جدلیات مادیت، پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ اور قدر زائد کے نام سے مشہور ہیں۔ دراصل تاریخ، سیاست اور اقتصادی قوانین کی وہ تشریحات ہیں جن کے ذریعہ مارکس یہ ثابت کرتا ہے کہ ماضی میں کیوں استحصال جاری رہا ہے اور آئندہ اشتراکی سماج میں کیوں یہ استحصال نہیں ہوگا۔

انسانی تاریخ کا قانون کیا ہے۔ مارکس کے نزدیک یہ بالکل وہی ہے جو مادی دنیا کا ہے۔ جس طرح مادی دنیا کی تمام چیزیں ایک عالم گیر قانون میں جکڑی ہوئی ہیں، اور اسی کے مطابق ان کے تمام خواص اور افعال ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی کا بھی ایک قانون ہے۔ انسان بظاہر شعور اور ارادہ رکھتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک خودمختار مخلوق ہے اور اپنی مرضی سے جو چاہے کر سکتا ہے۔ مگر انسان کے ارادہ کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ انسانی ذہن میں خارجی حالات کا عکس ہے۔ ایک تاریخی قانون ہے جو انسانی زندگی کی تمام سرگرمیوں کا حقیقی سبب ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر ہم تاریخ میں یہ دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے درمیان لوٹ کھسوٹ جاری رہی ہے تو اسی میں اس

---

[1] کمیونسٹ مینی فسٹو کا پہلا فقرہ

بات کا جواب بھی موجود ہے کہ لوٹ کھسوٹ کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جو قانون انسانی زندگی کو برہم کیئے ہوئے ہے، اس کو معلوم کر کے اسے ٹھیک طریقہ سے استعمال کرنا۔ جس طرح طوفان کی تباہی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ طوفان کے اندر ایک طاقت ہے اور اس طاقت کو اگر قابو میں لا کر اسے مفید اغراض کے لیے استعمال کیا جائے تو یہی طوفان جو آج تباہی کا سبب ہے یہی انسانیت کو بہت سے فائدے پہنچا سکتا ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی میں اس کے قانون کی ہولناکیاں دیکھ کر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر اس قانون کو موڑ کر اسے صحیح رخ پر چلا دیا جائے تو وہ زندگی کے لیے بے شمار فائدوں کا سبب بن جائے گا۔

سیاسی قانون یہ ہے کہ قدیم زمانے سے وہ طبقہ حکومت پر قابض رہا ہے جو سماج میں زیادہ طاقت ور تھا۔ جو وسائل و ذرائع کا مالک تھا، اس طبقہ کی حکومت کے معنی یہ تھے کہ جو لوگ سماج کے اندر زیادہ حقوق اور زیادہ ساز و سامان رکھتے ہیں، ان کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے حقوق اور فوائد کا تحفظ کر سکیں اور سیاسی طاقت کے ذریعہ اپنا بچاؤ کرتے رہیں۔ قدیم تاریخ میں یہی چیز سارے سیاسی مظالم کا سبب بنتی رہی ہے۔ اس چیز نے سیاست کو حقوق یافتہ طبقہ کا خادم بنا دیا اور اس کا کام صرف یہ ہو گیا کہ وہ دبے ہوئے طبقہ کو دبائے تا کہ جو لوگ اسے لوٹ رہے ہیں وہ اپنے لوٹنے کا کام پورے اطمینان کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔ اس لیے حکومت اب محروم طبقہ کو دینی چاہیئے۔ یعنی ان لوگوں کو جن کے پاس ذاتی طور پر ایسی کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے جس کے تحفظ کے لیے وہ سیاسی طاقت کو ناجائز طور پر استعمال کریں جب ایسے لوگوں کو حکومت دی جائے گی تو وہ آخر کس چیز کا بچاؤ کریں گے اور کس چیز کے تحفظ کے لیے دوسروں پر ظلم کریں گے۔

یہ طبقہ مارکس کے نزدیک مزدوروں کا طبقہ ہے۔ جدید صنعتی نظام نے مزدور طبقہ کو ملکیت سے محروم کر کے ایک عظیم تاریخی کام انجام دیا ہے۔ اس طرح ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا ہے جو سیاست کی باگ ڈور سنبھال سکے اور جس کے ہاتھ میں اختیارات دے کر کسی ظلم کا اندیشہ نہ کیا جا سکتا ہو۔ مارکس جدید نظام کو الٹ کر اسی طبقہ کے ہاتھ میں سارے سیاسی اختیارات دے دینا

چاہتا ہے جس کا نام اس نے پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ رکھا ہے۔

مارکس کے اقتصادی قانون کا عنوان ''قدر زائد'' ہے۔ اپنے اس نظریہ کے ذریعہ مارکس اس لوٹ کھسوٹ کی معاشی تشریح کرتا ہے جو اس کے نزدیک ساری انسانی تاریخ میں جاری رہی ہے۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان جو کچھ کماتا ہے یا اپنے لیے جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ محض انسانی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے جو شخص محنت کر کے کوئی چیز وجود میں لاتا ہے اس کو حق ہے کہ وہ اس کا مالک بنے، اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ جو لوگ خود محنت کر کے کچھ حاصل کر رہے ہیں وہ تو گویا اپنی محنت کی جائز کمائی لے رہے ہیں اور جو لوگ دوسروں کو مزدور رکھ کر ان سے کوئی کام کراتے ہوں اور پھر اس کام کے منافع سے دولت حاصل کرتے ہوں وہ گویا دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھارے ہیں۔ جو کچھ دوسروں نے کمایا تھا اس پر اپنا قبضہ کر لیتے ہیں۔

مارکس کے نزدیک یہی وہ معاشی قانون ہے جس نے سماج میں غیر معمولی نیچ اونچ پیدا کی ہے اور اس کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے ذرائع پیداوار پر نجی ملکیت تسلیم کی گئی اور ایک شخص کو یہ حق دیا گیا کہ وہ دوسروں کو مزدور رکھ کر ان سے کام لے۔ اس طرح ایک آدمی بہت سارے آدمیوں کو کام پر لگا کر ان کی محنت کے حاصل پر قبضہ کر لیتا ہے اور سرمایہ دار بن جاتا ہے۔ وہ مزدوروں کو ان کے کام کے معاوضہ میں تھوڑی سی مزدوری دیتا ہے اور ان کی کمائی کے بقیہ حصہ کو خود لے لیتا ہے۔ سادہ الفاظ میں کسی مزدور کے، حاصلِ محنت کی وہ مقدار جو مزدور کو نہیں دی گئی اور جس پر سرمایہ دار نے قبضہ کر لیا، اسی کا نام ''قدرِ زائد'' ہے جو مارکس کے معاشی قانون کا عنوان ہے۔

مارکس اس حالت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دینی چاہیے کہ وہ دوسروں کو اپنے یہاں مزدور رکھ کر ان سے کام لے۔ ہر شخص خود کام کرے اور اپنی محنت کے ذریعہ وہ جو کچھ حاصل کرتا ہے اس کا مالک بنے۔ اس طرح جب دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ختم ہو جائے گا تو وہ معاشی بنیاد باقی نہ رہے گی جو ایک طرف افلاس اور دوسری طرف سرمایہ داری پیدا کرتی ہے۔

یہ ہے مارکسی نظریات کا خلاصہ، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی چند مخصوص قوانین کی پابند ہے اور اسی کے مطابق اس میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ یہ نظریہ بظاہر کائنات اور انسان کے بارے میں ایک فلسفیانہ نظریہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر درحقیقت وہ اس سماجی آپریشن کی توجیہہ ہے جو مارکس نے زندگی کے مسائل کے حل کے طور پر پیش کیا تھا۔ اب ہم اس نظریہ کے صحیح یا غلط ہونے پر گفتگو کریں گے۔ اس گفتگو کے دوران میں بھی اس نظریہ کے بعض پہلوؤں کی تفصیل آئے گی جس سے اس کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔

مارکسزم کی نظریاتی ناکامی

مارکس انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پیدا ہوااوراس کے آخر میں اس کی وفات ہوئی۔ یہ زمانہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ بھاپ اور بجلی سے چلنے والی مشینوں کی ایجاد نے بے شمار لوگوں کو روزگار سے محروم کرکے صنعت وتجارت کا پورا میدان تھوڑے سے مل مالکوں اور کارخانہ داروں کے حوالہ کردیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا چند لوگ سرمایہ دار اور باقی تمام لوگ ان کے خریدار بن کر رہ گئے ہیں۔ اس صورت حال نے یورپ کے ذہن کو شدید طور پر متاثر کیا۔ اس کے حل کے لیے مختلف تدبیریں سوچی جانے لگیں۔ بالآخر مارکس پیدا ہوا جس نے سرمایہ داری کے خلاف یورپی ذہن کے ردّعمل کو ایک فلسفہ کی شکل میں مرتب کرڈالا۔ یہ فلسفہ دراصل ڈاکہ بازی کی ایک نئی شکل تھی جس کا مطلب خود مارکس کے لفظوں میں یہ تھا کہ "بے دخل کرنے والے طبقوں کو بے دخل" کردیا جائے[1]"۔ مگر مارکس کی خود پسندی نے اس کو گوارہ نہ کیا کہ وہ دنیا کے سامنے ڈاکو کے روپ میں آئے، اس نے دوسرے لوٹنے والوں سے اپنی لوٹ کو ممتاز کرنے کے لیے اس کو باقاعدہ ایک فلسفہ کی شکل دے دی۔ اس نے صرف یہی ثابت نہیں کیا کہ ایسا ہونا چاہیے، بلکہ یہ بھی دعویٰ کیا کہ تاریخ کا تقاضہ ہے کہ ایسا ہی ہو۔ اس کے سوا کچھ اور ہونا ممکن نہیں ہے۔ برٹرنڈ رسل کے الفاظ میں "وہ سوشلسٹ انقلاب کا علم بردار نہیں، پیشگوئی کرنے والا ہے" ۔[2]

مارکس نے جب اپنے پیش رو فلسفیوں پر تنقیدیں کرکے اپنا نظریہ پیش کیا تو اس زمانہ میں اس کو اس زور وشور کے ساتھ لیا گیا گویا کہ یہ آخری سچائی ہے جو انسان نے دریافت کرلی ہے۔ ہیگل پر تنقید کرتے ہوئے انگلس لکھتا ہے:

---

[1] کیپٹل، جلد اول، صفحہ ۷۶۳، (ماسکو ۱۹۵۴)

’’ہیگل کی بیشتر تفصیلات میں پیوند، بناوٹ اور آورد پائی جاتی ہے۔ ایک لفظ میں وہ سب کی سب غلط ہیں۔ ہیگل کا سسٹم بہت بڑی نارسائی تھی مگر یہ اپنی قسم کی آخری نارسائی تھی[1]۔

اس وقت یہ سمجھا جا رہا تھا کہ انسان نے آخری طور پر انسانیت کے راز کو پالیا ہے اور اب صرف اتنی سی دیر ہے کہ اس کو زندگی میں عملاً جاری کر دیا جائے۔ اس وقت اشتراکی حضرات کو اس نظریہ کی سچائی پر اس قدر یقین تھا کہ اس کو نافذ کرنے کے لیے اگر چند کروڑ انسانوں کو قتل ہو جانا پڑے تو اس کو وہ بہت معمولی چیز سمجھتے تھے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں دنیا کو مستقل کش مکش سے نکال کر ہمیشہ کے لیے آزاد کر دینے کی یہ بہت معمولی قیمت تھی۔ مگر تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ مارکسزم بھی اسی طرح ایک نظریہ ہے جس طرح دوسرے سابق فلسفیوں کے نظریات تھے۔ وقت نے مارکس کے نظریہ کی بہت سی خامیاں ظاہر کر دی ہیں۔ جن چیزوں پر پہلے صرف نظری بحث کی جا سکتی تھی۔ آج ہم ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ مارکس نے اپنے زمانے کے حالات میں انسانی سماج کا جو تجزیہ کیا تھا وہ بعد کے حالات میں غلط نکلا۔ اس نے جو طریق کار معین کیا تھا وہ بے کار نظر آیا۔ اس نے جو حل پیش کیا تھا، تجربے کے بعد وہ ظلم کی بدترین شکل ثابت ہوا۔ اس طرح بعد کے حالات نے خود ہی ان تمام باتوں کی تردید کر دی جن کی بنیاد پر مارکس نے مستقبل کے فلسفہ کے اصول[2]‘‘ مرتب کئے تھے۔ یہ گویا مارکسزم کے خلاف تاریخ کا فیصلہ تھا مگر مارکس کے متبعین نے اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کیا۔ ہر بار جب مارکسزم کی کوئی غلطی سامنے آئی تو انھوں نے لفظی الٹ پھیر کے ذریعہ فوراً اس کی تاویل پیش کر دی اور کہا کہ یہ ’’مارکسزم کے ذخیرہ میں نئی سچائیوں کا اضافہ‘‘ ہے۔ مگر یہ ’’نئی سچائیاں‘‘ دراصل مارکس کی غلطیوں کا اعتراف ہیں جو مزید غلطیوں کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ مارکسزم کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص دن کو رات ثابت کرنے کے لیے اپنا کمرہ بند کر کے کہے کہ دیکھو سورج کہیں نظر نہیں آتا۔ اور جب اس سے کہا جائے کہ یہ روشن دان سے جو کرنیں آ رہی ہیں وہ کس چیز کا ثبوت ہیں تو وہ جواب دے کہ احمق معمار نے روشن دان کا رخ غلط بنا دیا۔ ورنہ تم دیکھتے کہ کمرہ میں بالکل اندھیرا ہے اور یہ

---

[1] سوشلزم۔ یوٹوپین اینڈ سائنٹفک‘‘ بحوالہ کارل مارکس سلکٹڈ ورکس جلد اول صفحہ ۱۶۷ (ماسکو ۱۹۴۶ء)

کہتے ہوئے وہ بھول جائے کہ اس دلیل سے وہ خود اپنے پچھلے دعوے کی تردید کر رہا ہے۔

مارکس نے انیسویں صدی کے انگلستان کو سامنے رکھ کر سرمایہ داری پر تنقید کی تھی۔ یہ سرمایہ داری کا وہ دور تھا جب کہ مزدور کو حقیقی معنوں میں اجرتی غلام بنا کر رکھا جا رہا تھا اور اس سے نہایت قلیل اجرت پر ۱۶۔۱۶ اور ۲۰۔۲۰ گھنٹے کام لیا جاتا تھا۔ اس وقت فی الواقع انسانی زندگیوں سے دولت چوسی جا رہی تھی۔ مارکس کے الفاظ میں مزدور کا سرمایۂ زندگی چند لقمے، بوسیدہ چیتھڑے اور تاریک جھونپڑی'' کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مارکس نے اس وقت سرمایہ داروں کے مظالم کی داستان چُن چُن کر اکٹھا کی اور ان کو اپنی مشہور کتاب ''سرمایہ'' میں نہایت تفصیل کے ساتھ درج کر دیا۔ ایک سوشلسٹ مفکر کے بقول ''سرمایہ کے بہترین حصے وہ ہیں جو ان اقتصادی واقعات سے بحث کرتے ہیں، جن کا مارکس کو انسائیکلوپیڈیائی علم تھا۔''

''جون ۱۸۶۳ کے آخری ہفتہ میں لندن کے تمام روزانہ اخباروں میں سنسنی پیدا کرنے والے عنوان کے ساتھ ایک خبر شائع ہوئی ''محض زیادہ کام کرنے سے موت''۔ اس میں عورتوں کی ٹوپیاں بنانے والی ایک بیس سالہ لڑکی میری آنے والکی (Marry Anne Walkey) کی موت کا ذکر تھا جو لباس سازوں کی ایک باعزت فرم میں ملازم تھی اور ایلیزے (Elise) کے سہانے نام والی ایک خاتون کے ہاتھوں لوٹی جا رہی تھی۔ یہ لڑکی اوسطاً ۱۶ $\frac{۱}{۲}$ گھنٹے اور کاروباری دنوں میں اکثر بیس گھنٹے مسلسل کام کیا کرتی۔ چائے اور قہوہ کا استعمال اس کی گرتی ہوئی قوت کار کو سہارا دے رہا تھا۔ اب موسم عروج پر تھا اور فوری طور پر ان امیر زادیوں کے شان دار لباس تیار کرنے نہایت ضروری تھے، جنھیں نئی شہزادی ویلز کی آمد پر رقص کی اجازت ملی تھی۔ میری آنے والکی نے لگا تار ۲۶ $\frac{۱}{۲}$ گھنٹے کام کیا۔ اس کے ساتھ ساٹھ لڑکیاں اور بھی تھیں، جن میں سے تیس ایک کمرہ میں کام کرتی تھیں، اور اس طرح صرف $\frac{۱}{۳}$ مکعب فٹ ہوا ہر ایک کو ملتی تھی۔ رات کو وہ دو ۲ دو ۲ ہو کر ان تنگ سرنگوں میں پڑ رہتیں، جن میں تختوں کے ذریعہ سونے کے خانے تقسیم کیے

ہوئے تھے اور یہ لندن کے بہترین ٹوپیوں کے کارخانوں میں سے ایک تھا۔ میری آنے والکی جمعہ کو بیمار پڑی اور اتوار کو مرگئی۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد جیوری کے آگے بیان دیا کہ میری آنے والکی کی موت کھچا کھچ بھرے ہوئے کمرے میں زیادہ کام کرنے اور تنگ و تاریک جگہ سونے کے باعث ہوئی ہے۔ مگر جیوری کا فیصلہ یہ تھا کہ مرنے والی مرگی سے مری ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ کمرہ کی بھیڑ اور زیادہ کام نے اس کی موت کا وقت کچھ قریب کر دیا ہو[1]۔''

اس قسم کے واقعات سے ''سرمایہ'' کے صفحوں کے صفحے اور باب کے باب بھرے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے بھیانک واقعات جمع کرنے سے مارکس کا مقصد یہ تھا کہ اپنے پیرووٴں کے دل میں سرمایہ داری کے خلاف شدید نفرت پیدا کر دے اور تاریخ کی سب سے ہولناک جنگ ـــــ طبقاتی جنگ کے خلاف لڑائی کے لیے تیار کرے۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ سرمایہ داری نظام کے خلاف گولہ باری کے لیے اس نے جن چیزوں کو نشانہ بنایا تھا، ان میں سے بہت سے نشانے اب اپنی جگہ پر باقی نہیں رہ گئے ہیں۔ آج اگر سرمایہ دارانہ ظلم کی وہ مثالیں ڈھونڈی جائیں جن سے مارکس کی تحریریں بھری پڑی ہیں اور جن کے متعلق اس کا خیال تھا کہ مزدور انقلاب ہی ان کا خاتمہ کر سکتا ہے تو ممکن ہے ''اشتراکی جنت'' میں اس کی مثال مل جائے۔ ورنہ عام سرمایہ دار ممالک میں اس کی مثالیں نہیں ملیں گی۔ اب اُجرتیں بڑھ گئی ہیں، کام کے اوقات گھٹا دیئے گئے ہیں، مختلف قسم کے الاوٴنسوں کا حق تسلیم کیا گیا ہے، مزدوروں کی رہائش، علاج اور دوسری ضروریات کے لئے نسبتاً بہتر انتظامات ہو گئے ہیں۔ مزدوروں کو خود کارخانے کے منافع اور اس کے نظم و نسق میں شریک کیا جانے لگا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ کی تین سو کے قریب کمپنیاں اپنے مزدوروں کو کمپنی کے حصے خریدنے کی آسانیاں مہیّا کر رہی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۷ کے آخر تک بیس ہزار مزدور اور ملازم اپنی کمپنیوں کے حصہ دار بن چکے تھے۔ آج کا ماہر مزدور چھوٹے پیمانے پر خود بھی ایک سرمایہ دار ہوتا ہے۔ پھر سب

---

[1] کیپٹل، جلد اول، صفحہ ۲۵۴۔۲۵۵، ماسکو ۱۹۵۴

سے بڑی بات یہ کہ لندن کے مشہور کتب خانہ ''برٹش میوزیم'' میں ۳۵ سال کے مطالعہ کے بعد مارکس نے سرمایہ داری نظام کے جس ''ناگزیرانجام'' کا ''انکشاف'' کیا تھا وہ صحیح نہیں نکلا۔ مارکس نے کہا تھا کہ سرمایہ داری نظام ایک بہت بڑے تضاد سے دوچار ہے۔ یہ مزدور اور سرمایہ دار کا تضاد ہے۔ اس نظام میں ساری دولت اور ذرائع پیداوار سمٹ کر چند لوگوں کے ہاتھ میں آگئے ہیں اور باقی لوگوں کے لیے اس کے سوا زندگی کی اور کوئی شکل باقی نہیں رہ گئی ہے کہ وہ ان کے اجرتی غلام بن جائیں۔ ایک طرف مٹھی بھر سرمایہ دار ہیں جن کے پاس سب کچھ ہے اور دوسری طرف مزدوروں کی بھیڑ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہ دو مختلف طبقے ہیں جن کا مفاد کہیں بھی ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ مارکس نے پیشین گوئی کی تھی کہ صنعتی نظام اس طبقاتی امتیاز کو اور بڑھائے گا، اور مزدور اور سرمایہ دار دو مخالف کمپنیوں میں تقسیم ہوتے چلے جائیں گے۔ اس نے کہا تھا کہ موجودہ جمہوری نظام میں قوم و وطن کے نام پر امیر و غریب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش بورژوا کا فریب ہے جس میں پرولتاری طبقہ کا کوئی فائدہ نہیں۔'' قوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر ظلم کرتا ہے۔ خواہ کسی جمہوری حکومت میں ہو یا قدیم شاہی حکومت میں[1]۔ اس کو یقین تھا کہ قوم و وطن کے نام پر مزدور طبقہ کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹنے کا فریب بہت جلد ختم ہو جائے گا اور سب کے سب مزدور ایک ہو جائیں گے۔''

فریڈرش انگلس نے انیسویں صدی کے آخر میں اعلان کیا تھا کہ '' آج تمام ملکوں کے مزدور متحد ہو چکے ہیں[2]۔'' چنانچہ اس زمانہ میں مارکسی مفکرین کا خیال تھا کہ کوئی عالم گیر جنگ چھڑی تو ساری دنیا کے مزدور بیک وقت اپنے ملک کی سرمایہ دار حکومتوں کے خلاف بغاوت کر دیں گے اور روئے زمین سے ہمیشہ کے لیے سرمایہ داری نظام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر اس کے برعکس جب پہلی جنگ عظیم چھڑی تو ہر ملک کے مزدوروں نے مارکسی نظریہ ترک کر کے حکمراں طبقہ کا ساتھ دیا۔ طبقاتی مفاد کے

---

[1] پرنسپلس اینڈ پریکٹسز آف کمیونزم، ۴

[2] مینی فسٹو کے جرمن ایڈیشن ۱۸۹۰ صفحہء پر انگلس کا دیباچہ صفحہ ۳۴

بجائے ان پر قومی مفاد غالب آ گیا۔ انھوں نے اپنے ملک کے مزدوروں سے جنگ کی۔ اس جنگ سے پہلے دوسری انٹرنیشنل[1] کی ایک کانگرس بیسل (سوئزرلینڈ) میں ہوئی جس میں ساری دنیا کے مزدوروں کے نمائندے جمع ہوئے تھے اور انھوں نے ''جنگ کے خلاف جنگ'' کا اعلان کیا تھا۔ انھوں نے اپنے وطن کی سامراجی حکومتوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر انھوں نے جنگ شروع کی تو وہ بغاوت کر دیں گے۔ مگر لڑائی ہونے کے بعد تجویز بالائے طاق رکھ دی گئی اور مزدوروں کے سامنے ایک نیا نعرہ پیش کیا گیا ــــــ ''وطن کی خاطر جنگ'' ایسا وطن جو مارکسی منطق کے مطابق مزدور کا نہیں بلکہ سامراج کا وطن تھا، ''نعروں کے اس طرح بدل جانے سے کروڑوں مزدور موت کے گھاٹ اتر گئے۔''

اس واقعہ کا ذکر کمیونسٹ انٹرنیشنل کی چھٹی کانگریس (۱۹۱۸) کی قرارداد میں ان لفظوں میں آیا ہے:

''۱۹۱۴ کی جنگ میں سوشلسٹوں کی بین الاقوامی انجمن (دوسری انٹرنیشنل) نہایت شرمناک طریقہ پر ختم کر دی گئی۔ اس کے لیڈروں نے مارکس اور انگلس کے کمیونسٹ مینی فیسٹو کے بالکل مخالف راہ اختیار کی جس میں بتایا گیا ہے کہ سرمایہ داری نظام میں پرولتاری طبقہ کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ سٹٹ گارٹ (stuttgart) اور بیسل (Basle) کی کانگریس میں جنگ کے خلاف جو تجویزیں منظور کی گئی تھیں ان کی مخالفت کی۔ چند ایک کے سوا تمام ملکوں کے مزدور لیڈروں نے جنگی قرضہ کی تائید کی، سامراجی مادرِ وطن (ایسی حکومت جس پر سامراجی سرمایہ داروں کا قبضہ تھا) کی حفاظت کرنے کے بجائے اس کی تائید کی اور سامراجی جنگ کی مخالفت کرنے کے بجائے اس کے وفادار سپاہی بن گئے۔ مختلف ملکوں میں انقلاب کو کچلا گیا تو اس میں عملی مدد کی۔ ہنگری میں کامیاب پرولتاری انقلاب کے ساتھ نہایت شرمناک طریقہ پر غداری کی۔ مجلس جمیعتہ اقوام میں شریک ہوئے اور غلام ملکوں کے خلاف اپنی سامراجی حکومتوں کی تائید کی۔ انھوں نے سامراجی

[1] مزدور طبقہ کی بین الاقوامی جماعت جو ۱۸۸۹ میں قائم کی گئی تھی۔ اسٹالن نے لکھا ہے کہ ایک طرف مارکس اور اگلز اور دوسری طرف لینن کے درمیان ایک پورا دور گزرا ہے جس میں بلاشرکت غیرے دوسری انٹرنیشنل کا بول بالا رہا ہے۔'' پرابلمز آف لینن ازم صفحہ ۱۴

فوجی قانون پاس کرائے ۔انہوں نے مزدوروں کی مخالفت کی ۔ وہ سرمایہ داروں کے ڈھنڈورچی اور غلام بن گئے‘‘۔

ان واقعات نے مارکسی تجزیے کو بے معنیٰ بنا دیا۔ دنیا کے مزدور تمام دنیا کے سرمایہ داروں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کے بجائے ہر ملک میں اپنے سرمایہ داروں کے ساتھ ہو گئے تھے۔اس کے صریح معنی یہ تھے کہ اقتصادی لائنوں پر تاریخ کے لازمی سفر کا جو نظریہ پیش کیا گیا تھا وہ صحیح نہ تھا۔ چنانچہ اس کی توجیہہ کے لیے مارکسیوں نے اعلان کیا کہ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ سرمایہ داری نظام میں چند خاص تبدیلیاں آ گئی ہیں۔لینن نے اپنی مشہور کتاب ’’امپریلزم‘‘ میں بہت سے اعداد و شمار اور معلومات جمع کیں اور ثابت کیا کہ یہ سرمایہ داری نظام کا ’’سامراجی دور‘‘ ہے جو ۱۹۰۰ کے لگ بھگ سے شروع ہوتا ہے۔اس نے سامراجی دور کی بہت سی خصوصیات گنائیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صنعتی سرمایہ داری زیادہ وسیع ہو کر اجارہ داری کے دور میں داخل ہو گئی ہے۔اس طرح سرمایہ داروں کا منافع بہت بڑھ گیا ہے جس کا اثر مزدور تحریک پر بھی پڑتا ہے اور جن کے پاس مارکس کے الفاظ میں ’’اپنی بیڑیوں کے سوا‘‘ کھونے کے لیے کچھ نہ تھا، وہ اب پہلے سے زیادہ خوش حال ہو گئے ہیں۔ مارکس نے انگلستان میں سرمایہ داری نظام کی تشریح کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا تھا کہ انگلستان پہلا ملک ہے جس نے مشین کی بنی ہوئی چیزیں دنیا کے دوسرے حصوں میں پہنچائیں اور اس طرح جو نفع ہوا اس سے مزدوروں کو بھی حصہ ملا، بلکہ بعض ماہر مزدوروں اور سوتی کپڑے کی صنعت میں کام کرنے والوں کا معیار زندگی دوسرے ممالک کے مزدوروں سے کافی بڑھ گیا۔ اور یہ طبقہ اپنے کو سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ سے وابستہ کرنے لگا۔ لینن نے بتایا کہ یہ صورت ہر اس سرمایہ دار ملک میں پیش آتی ہے جو سامراجی دور میں داخل ہو جاتا ہے اور مزدور جو خوش حال ہو جاتے ہیں (خاص طور پر اس گروہ کے لیڈر) وہ موقع پرست بن جاتے ہیں اور موقع ملنے پر اپنے پورے طبقہ کی طرف سے مل مالکوں سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔[۱]

کس قدر عجیب ہے یہ تاویل جس کے ذریعہ تاریخ کے مادّی نظریہ کی صفائی پیش کی گئی ہے اور

---

۱ ایمل برنس، وھاٹ از مارکسزم، صفحہ ۲۷ (بمبئی ۱۹۵۲)

سرمایہ داری نظام کے خلاف طبقاتی لڑائی جاری رکھنے کا بہانہ تلاش کیا گیا ہے۔ ایک طرف مارکسزم کا دعویٰ ہے کہ سرمایہ داری نظامِ تاریخ کے اقتصادی سفر کی ایک مخصوص منزل ہے جس کی ترقی سے محنت اور سرمایہ کا تضاد زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی دعویٰ ہے کہ اسی عمل سے یہ تضاد کم ہوجاتا ہے۔ گویا سورج نکلنے کے بعد کبھی دن آتا ہے اور کبھی سورج نکلتا ہے تو رات کی تاریکی اور بڑھ جاتی ہے۔ مارکسزم کے تضاد کو رفع کرنے کی کوشش میں اس کے اندر مزید تضادوں کا اضافہ کردینا یہی لینن کا وہ سب سے بڑا فکری کارنامہ ہے جس کو مارکسی تعلیمات سے جوڑنے کے لیے ''مارکسزم لینن ازم'' کی اصطلاح وضع کی گئی اور کہا گیا کہ ''لینن ازم مارکسزم سے انحراف نہیں بلکہ اس کی ترقی یافتہ شکل ہے۔'' ایک کمیونسٹ مصنف نے لکھا ہے:

''لینن ازم کو نہ ماننا خود مارکسزم کا انکار کرنا ہے۔''

روزا لکسمبرگ نے اس قسم کے واقعات کو سامنے رکھ کر کہا ہے کہ: ''روسی کمیونسٹوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے سوشلسٹ خیالات کے ذخیرہ میں نئی سچائیوں کا اضافہ کیا ہے مگر یہ سچائیاں دراصل وہ غلطیاں ہیں جو انھیں روس میں حالات کے تحت مجبوراً کرنی پڑی تھیں۔''

لینن کی تاویل کے اس نقص سے اگر قطع نظر کرلیا جائے، جب بھی یہ تاویل اس کے خلاف جاتی ہے۔ یہ دراصل اشتراکی فلسفہ کی پوری بنیاد کو ڈھارہی ہے۔ مارکس نے ماضی کے تمام قوانین کو یہ کہہ کر رد کردیا تھا کہ کوئی قانون ایسا نہیں ہوسکتا جو ہر زمانہ اور ہر قسم کے حالات کے لیے درست ہو۔ اس نے کہا تھا کہ ''انسانی سوسائٹی میں جب بھی اس قسم کے غیر سائنٹفک نقطہ نظر سے کام لیا جاتا ہے تو ہمیشہ تباہی کا منھ دیکھنا پڑتا ہے''۔ کیوں کہ ''تمام عقیدے ایک خاص زمانہ کی طبقہ واری زندگی کا عکس ہوتے ہیں اور بعد کے حالات میں جب کہ زندگی کی سابق نوعیت بدل چکی ہوتی ہے، وہ عقیدے بھی بیکار ہوجاتے ہیں بلکہ ترقی کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔'' مگر مارکسزم کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ اس نے انسان کو قوم پرستی اور فرسودہ عقیدوں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلادی ہے۔ اس نے ساری کائنات کا تجزیہ کرکے نہ صرف حال کی مکمل اور صحیح تصویر پیش کی ہے بلکہ مستقبل کی راہِ عمل بھی بتادی ہے۔ مگر

بعد کے تجربات سے یہ دعویٰ غلط ثابت ہو گیا۔ مارکس نے جن حالات کے پیش نظر انسانیت کے مسئلہ پر غور کیا تھا وہ حالات ہی بدل گئے۔ سرمایہ داری نظام سامراجی نظام کے مرحلہ میں پہنچ گیا اور مل مالکوں کے خلاف مزدوروں کی ناقابلِ صلح کش مکش موافقت اور ہم آہنگی میں تبدیل ہو گئی۔ اس طرح جب حالات بدل گئے تو خود مارکسی منطق کے مطابق، وہ حل بھی بے معنی ہو گیا جو گزرے ہوئے حالات کے لیے اس کے اندر رہ کر سوچا گیا تھا۔ اس صورت حال نے مارکسیوں کی وہ تمام تنقیدیں جو انھوں نے ماضی کے فلسفوں کو غلط ثابت کرنے کے لیے ان پر کی تھیں خود مارکسزم پر چسپاں کر دیں۔ مگر مارکسی حضرات یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ اشتراکی پیغمبر کا حل کبھی بے کار بھی ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے تمام تضادات کو رفع کرنے کے لیے انھوں نے برجستہ ایک نئی تاویل ایجاد کر لی، انھوں نے کہا:

> ''سوسائٹی کے ارتقاء کا سائنٹیفک نقطۂ نظر، دوسرے تمام سائنٹیفک علوم کی طرح تجربہ، تاریخی حقائق اور اطراف کی دنیا پر مبنی ہے، جو ہم کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس لیے مارکسزم آخری طور پر تکمیل یافتہ نظریہ نہیں ہے۔ جوں جوں تاریخ ترقی کرتی ہے، انسان زیادہ تجربات حاصل کرتے ہیں اس کے مطابق مارکسزم بھی ہمیشہ ترقی کرتی رہتی ہے اور نئے حقائق جو روشنی میں آتے ہیں، ان پر اس کا انطباق ہوتا رہتا ہے۔'' [1]

دوسرے لفظوں میں جس طرح کیمیا اور طب وغیرہ سائنٹفک علوم ہیں، ٹھیک اسی طرح انسانی سماج کی بھی ایک سائنس ہے۔ کیمیا اور طبعیات طبعی سائنس ہیں، حیوانات اور طب وغیرہ حیاتیاتی سائنس ہیں۔ اسی طرح مارکسزم معاشرتی سائنس ہے۔ جس طرح دوسرے علوم میں انسان تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ نئے نئے حقائق دریافت کرتا رہتا ہے اور اس کو ترقی دیتا ہے، اسی طرح سماج کے بارے میں مارکس کا فلسفہ بھی حالات اور تجربات کے ساتھ ترقی کرتا رہتا ہے۔

یہ توجیہہ پیش کر کے مارکسی حضرات خوش ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ کے لیے اپنی مشکل حل کر لی۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر انسانیت کا علم بھی طبیعی علوم کی طرح ایک علم ہے جو ہمیشہ تجربات اور مشاہدات

---

[1] ایمل برنس، صفحہ ۱

سے بدلتا رہے گا تو پھر آپ طبقاتی جنگ اور ذاتی ملکیت کی تنسیخ کے حل کو جو انیسویں صدی میں سوچا گیا تھا، کس دلیل کی بنا پر اسے بیسویں صدی کی نسل پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو اقرار ہے کہ انسان کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جس کو ابھی آخری طور پر انسان سمجھ نہیں سکا ہے۔ پھر انسان اور انسان کو ٹکرانے اور لوگوں کو ان کی ملکیتوں سے محروم کرنے کا انتہائی اقدام آپ کس علم ویقین کی بنا پر کر رہے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جس چیز کو آپ حل کہہ رہے ہیں وہ آپ کی ایک غلطی ہو جو آپ نے ناتمام مطالعے اور غلط معلومات کی روشنی میں سوچ لیا ہو۔ پھر ماضی کی غلطی کو مستقبل تک وسیع کرنے کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے۔ جب آپ خود یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ انسانیت کا حقیقی علم اور اس کے لیے ابدی قانون ابھی تک دریافت نہیں کیا جا سکا ہے۔ انسان اپنے تجربہ اور مطالعہ سے ہمیشہ اس کی طرف بڑھتا رہے گا۔ ایسی حالت میں آپ کے لیے یہ تو جائز ہے کہ لیبارٹریوں اور کتب خانوں میں آپ آخری علم تک پہنچنے کی کوشش جاری رکھیں۔ مگر آپ کو کیا حق ہے کہ دوران تحقیق میں جو تمام معلومات آپ کو حاصل ہو جائیں، آپ انسانی زندگی میں ان کا ہولناک تجربہ شروع کر دیں۔ کیا انسانی زندگی بھی کوئی مردہ لاش ہے جس کو میڈیکل کالج کے طالب علموں کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے تجربات کے لیے اس کی چیر پھاڑ کرتے رہیں۔

اشتراکی لٹریچر پورا کا پورا اسی قسم کے تضادات سے بھرا ہوا ہے۔ مارکسی مفکرین اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے ایک دعویٰ کرتے ہیں اور بعد کو جب حقائق اس کے خلاف جاتے ہوئے نظر آتے ہیں تو پوری ڈھٹائی کے ساتھ فوراً ایک دوسرا دعویٰ کر دیتے ہیں جو پہلے دعوے کی عین ضد ہوتا ہے۔ میں یہاں بتاؤں گا کہ مارکسزم کی نظریاتی بنیاد کس قدر کمزور ہے اور کس طرح وہ اپنی تردید آپ کر رہی ہے۔

تاریخی مادیت کا فریب :

اشتراکی لٹریچر میں جہاں ماضی اور حال کے سماج کا تجزیہ کیا گیا ہے، اس کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انسان کتّے سے زیادہ خودغرض اور بھیڑیئے سے زیادہ خونخوار ہے۔ اس کو تاجر اور صنعت کار

بننے کا موقع ملتا ہے تو دوسروں کو لوٹنا شروع کر دیتا ہے۔اس کو اقتدار مل جاتا ہے تو اپنے جیسے انسانوں کو غلام بنا لیتا ہے۔اس کو سرمایہ داروں اور وقت کے حکمرانوں کی طرف سے کچھ نفع کا لالچ دے دیا جائے تو محض اپنے ذاتی فائدے کے لیے وہ ہزاروں انسانوں کے ساتھ غداری کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ غرض قوت اور اسباب و ذرائع کا تھوڑا سا حصہ بھی کسی انسان کو بگاڑ دینے کے لیے کافی ہے۔اس نظریے کے مطابق، ساری انسانی تاریخ لوٹ کھسوٹ کی تاریخ ہے۔دنیا اس کی نگاہ میں کتّوں کا دسترخوان ہے جہاں معاشی مفاد اور مادی خوش حالی کے لیے سارے انسان چھین جھپٹ کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے مصلحین اور پیغمبر سے لے کر عوام تک کسی کے سامنے اس کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں۔ جس کو موقع مل گیا ہے وہ لوٹ رہا ہے اور جو ابھی محروم ہے وہ اس کوشش میں ہے کہ کسی طرح وہ بھی لوٹنے والوں کی صف میں پہنچ جائے۔مارکس کے نزدیک انسان اگر مذہب و اخلاق کی بات کرتا ہے تو صرف اس لیے کہ اپنی مکاریوں پر پردہ ڈالے۔وہ قانون بناتا ہے تو اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ اپنی لوٹ کھسوٹ کے لیے قانون کی حمایت حاصل کرے۔وہ فلسفہ کا درس دیتا ہے تو صرف اس لیے کہ اپنی ظالمانہ کارروائیوں کے لیے علمی دلیل فراہم کرے۔حتیٰ کہ وہ ازدواجی زندگی اختیار کرتا ہے تو اس سے بھی اس کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ ناجائز طریقے سے سمیٹی ہوئی دولت کے لیے اپنا ایک وارث چھوڑ جائے۔یہ سارے کام صرف سرمایہ دار لوگ ہی نہیں کرتے جو اشتراکی شریعت میں سب سے بڑے مجرم ہیں بلکہ خود غریب طبقہ کا حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔چنانچہ مزدوروں کو اگر اپنے کارخانہ دار سے کچھ نفع کی امید ہو جائے تو وہ بھی اپنے کو سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ سے وابستہ کرنے لگتے ہیں۔جیسا کہ انگلستان کے بارہ میں مارکس نے لکھا ہے۔اسی طرح چھوٹے کسانوں کی انجمن امداد باہمی کے بارے میں مارکس نے لکھا ہے کہ وہ خوش حال کسانوں کے لیے تو بہت کچھ کرتی ہے مگر غریب کسانوں کی بہت بڑی تعداد کے لیے اس کا کرنا، نہ کرنا برابر ہے۔یہ انجمنیں خود بھی اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کا استحصال کرنے لگتی ہیں۔[1]

[1] کارل مارکس، سلکٹیڈ ورکس، جلد اول، ۳۶۔

اشتراکی لٹریچر پچھلی تاریخ کے بارے میں اس طرح کے بیانات سے بھرا ہوا ہے۔ مارکسی لٹریچر کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں اس خیالی سماج کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جو اشتراکیت اپنے دعوے کے مطابق مستقبل میں تعمیر کرنا چاہتی ہے یا دوسرے لفظوں میں جو مارکسی تشریح کے مطابق مستقبل میں آنے والا ہے۔ یہ سماج مارکس کے نزدیک وہ سماج ہے جہاں ملکیت کے قانون کو ختم کر دیا جائے گا اور سرمایہ حاصل کرنے کے تمام ذرائع کو ریاست کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ اشتراکیوں کے نظریہ کو ایک جملہ میں یوں ادا کر سکتے ہیں۔

''افراد کی ذاتی ملکیتوں کو ختم کر کے ان کو مزدور نمائندوں کے ہاتھ میں دینا اور اس طرح مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنا''۔ اشتراکیت کا دعویٰ ہے کہ ملکیت کی تنسیخ کے بعد سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے اور انسانیت ہمیشہ کے لیے بدحالی اور جنگ سے نجات پا جائے گی۔ اس نظام میں آدمی اس حد تک بدل جائے گا کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ابتداءً سیاسی اور اقتصادی معاملات کی ڈکٹیٹر شپ دی جائے گی، کچھ دنوں کے بعد وہ خود ہی اپنے تمام اختیارات سے دست بردار ہو جائیں گے۔ سماج کے تمام افراد اس قدر فرشتہ صفت ہو جائیں گے کہ عدالت اور پولیس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

مارکس نے پچھلی انسانی تاریخ کا جو تجزیہ کیا ہے اس کے تحت اگر وہ یہ تجویز کرتا کہ روئے زمین سے ہمیشہ کے لیے نسل انسانی کا خاتمہ کر دیا جائے تو یہ بات خواہ کتنی ہی غلط ہو مگر ہم کہہ سکتے تھے کہ اپنے تجزیہ کے مطابق وہ جس نتیجہ پر پہنچ سکتا تھا اس کو سچائی کے ساتھ اس نے پیش کر دیا ہے۔ مگر جب وہ کہتا ہے کہ ذرائع پیداوار کو عام لوگوں سے چھین کر حکومت کے قبضہ میں دے دیا جائے تو دراصل وہ اتنے بڑے تضاد کا مظاہرہ کرتا ہے جس کی امید ایک پاگل کے سوا کسی اور شخص سے نہیں کی جا سکتی۔ ایک طرف تو وہ کہتا ہے کہ کسی سماج میں زمین، کارخانے، مشینیں اور دوسرے ذرائع پیداوار جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، پورا سماج ان کا غلام بن جاتا ہے مگر انہی چیزوں کو جب وہ نجی سرمایہ داروں سے چھین کر ''مزدور ڈکٹیٹروں'' کے ہاتھ میں دے دیتا ہے تو اس کے نزدیک ساری برائی کا خاتمہ ہو جاتا

ہے اور انسانیت ہمیشہ کے لیے سیاسی، معاشی اور تمدنی غلامی سے نجات پا جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی تلوار ہے جو نجی قبضہ کے طور پر کسی کے پاس ہو تو وہ کاٹتی ہے لیکن اگر اس کو سماجی نمائندوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو اس کی دھار کند ہو جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جن ذرائع کو پا کر مٹھی بھر سرمایہ داروں کا یہ حال ہوا ہے انہی ذرائع کو جب مٹھی بھر ''کامریڈ'' اپنے ہاتھوں میں پائیں گے تو آخر ان کا حال اس سے مختلف کیوں ہوگا۔ مارکسی نظریہ کے مطابق، قدیم ترین انسانی سماج اشتراکی سماج تھا جو لوٹ کھسوٹ اور ظلم سے پاک تھا مگر انہی میں سے کچھ لوگوں کے پاس جب دوسرے سے زیادہ ذرائع و وسائل اکٹھا ہو گئے تو وہ ظالم اور لٹیرے بن گئے۔ پھر موجودہ زمانے کے سوشلسٹ سماج میں جن لوگوں کو اس سے بہت زیادہ ذرائع و وسائل کا چارج دیا جائے گا وہ آخر کیوں ظالم اور لٹیرے نہیں بنیں گے۔

یہ ایک عظیم تضاد ہے جس کو دور کرنے کے لیے مارکس اپنے ''تاریخ مادیت'' کے نظریہ سے مدد لیتا ہے۔ مارکس کا فلسفہ جو اس نے کائنات اور انسان کی تشریح کے لیے مرتب کیا ہے وہ محض کائنات اور انسان کی تشریح نہیں کرتا بلکہ اس سے بڑھ کر وہ اس حل کو صحیح ثابت کرتا ہے جو مارکس نے انسانی زندگی کے لیے پیش کیا ہے اور سماجی آپریشن کے متعلق ان کارروائیوں کی توجیہہ کرتا ہے جو مارکس نے تجویز کی ہیں۔ ہم یہاں مارکسی فلسفہ کا اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں گے۔

ڈاروینی نظریہ کے مطابق، دنیا ایک زمانہ میں بے جان مادّہ تھی۔ پھر جاندار مادّہ پیدا ہوا، اور اس کے ارتقاء کے دوران میں نباتات اور حیوانات وجود میں آئے۔ آگے چل کر ان میں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ حیوان کے ارتقاء کی آخری کڑی انسان ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ شعور سے پہلے مادہ موجود تھا۔ مادہ پہلے پیدا ہوا اور اس کے اندر شعور بعد میں آیا۔ دوسرے لفظوں میں شعور مادّہ کو پیدا نہیں کرتا بلکہ مادہ کے ارتقاء کے ایک خاص دور میں خود بخود اس کے اندر شعور آ جاتا ہے۔

مارکس نے اس مفروضہ کو انسانی سماج کے مطالعہ کے لیے استعمال کیا، اور اس کو بعینہٖ اس کے اوپر چسپاں کر دیا۔ مادہ کی جگہ اس نے معاشی حالات کو دی اور یہ دعویٰ کیا کہ ''انسان کے شعور سے اس

کی ہستی وجود میں نہیں آتی بلکہ اس کی ہستی ہے جس سے اس کا شعور وجود میں آتا ہے[1] اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص صحیح یا غلط جو رویہ اختیار کرتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اس کی خواہش پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھی یا اس نے الگ سے سوچ کر یہ طے کیا تھا کہ ایسا کرنا ہے، بلکہ آدمی کے تمام خیالات اس کی معاشی زندگی کا عکس ہوتے ہیں۔ جس طرح آئینہ میں وہی عکس پڑے گا جو اس کے سامنے ہو۔ اسی طرح ذہن میں وہی خیالات پیدا ہوں گے جو معاشی حالات کے اندر پہلے سے موجود ہیں۔ کسی دور میں معاشی پیداوار کے جو طریقے رائج ہوتے ہیں، اسی کے مطابق انسان کے عادات واخلاق بنتے ہیں اور وہی آدمی کے بھلے یا برے رویے کو متعین کرتے ہیں۔ کائنات کی تمام چیزیں اطراف کے حالات سے متاثر ہوتی ہیں۔ ہر چیز پر تپش، موسم، ہوا کے دباؤ اور دوسری بہت ساری چیزوں کا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح انسانی سوسائٹی خارج کے مادی ماحول سے متاثر ہوتی ہے اور اس کے مطابق کوئی شکل اختیار کرتی ہے۔ لینن نے اسی بات کو اپنے لفظوں میں اس طرح کہا ہے:

''بورژوا عالموں کے نزدیک جو عمل محض ایک جنس کا دوسری جنس سے تبادلہ ہے، وہ مارکس کے نزدیک انسانوں کے باہمی تعلق کو ظاہر کرتا ہے''۔

اس تصور کے مطابق عمل پہلے ہوتا ہے اور اصول ونظریات اس کے بعد وجود میں آتے ہیں۔ عملی طریقے جن سے آدمی اپنی روزی حاصل کرتا ہے وہی اس کے خیالات کے بنیاد بنتے ہیں۔ انہی پر سیاست اور تمدن کا پورا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے۔ ہر زمانہ میں جو اصول ونظریات رائج ہوتے ہیں اور ادارے قائم ہوتے ہیں ان کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ وہ اس دور کی معاشی زندگی کا عکس ہوتے ہیں۔

اس طرح مارکس نے اس بات کی توجیہہ فراہم کی۔ کیوں کہ اب تک تمام پچھلے سماج ـــــ ابتدائی سماج کے بعد ـــــ ظلم اور لوٹ کھسوٹ پر مبنی تھے، اور کیوں آنے والا سوشلسٹ سماج انصاف اور باہمی ہمدردی پر مبنی ہوگا۔ اس نے بتایا کہ انسان ظالم اور لٹیرا اس لیے نہیں تھا کہ پہلے سے اس کے اندر اس کا ارادہ موجود تھا یا اس کے دماغ نے اس سے کہا تھا کہ تم ایسے ہی بنو، بلکہ اس کی ذمہ داری دراصل ان

---

[1] کریٹک آف پولیٹکل آف اکانومی کی تمہید۔

معاشی حالات اور اس طریق پیداوار پر ہے جو اب تک دنیا میں رائج تھے۔لوگوں کی ذہنیت اور ان کا اخلاق بدل سکتا ہے اگر ان کی مادی زندگی بدل جائے ، اس طریقہ کو بدلا جائے جس سے وہ روزی حاصل کرتے ہیں۔ دنیا میں اس وقت ملکیتی نظام رائج ہے۔یعنی دولت حاصل کرنے کے ذرائع افراد کے قبضہ میں ہیں۔مثلاً کھیتی ہے تو اس کی شکل یہ ہے کہ ہر کھیت والا اپنے اپنے قطعہ پر الگ الگ کھیتی کرتا ہے۔ یہ طریق پیداوار لازمی طور پر افلاس پیدا کرتا ہے اور باہمی نفرت اور خود غرضی سکھاتا ہے۔ اپنے اپنے کھیتوں پر الگ کھیتی چلانے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کو صرف اپنے مفاد سے دلچسپی ہو، اس کو بدل کر اگر مشترکہ کاشت کا نظام رائج کر دیا جائے تو پیداوار کا محرک انفرادی نفع کے بجائے اجتماعی نفع بن جاتا ہے۔ بیج بونے اور ہل چلانے کا عمل صرف زمین سے غلّہ اگانے کا عمل نہیں ہے بلکہ وہ کسان کے ذہن کی تربیت بھی کرتا ہے۔انفرادی طریق کاشت میں آدمی صرف اپنے لیے کام کرتا ہے۔اس لئے یہ طریقہ آدمی کے اندر انفرادی ذہنیت پیدا کرتا ہے، اس کو بتاتا ہے کہ تم صرف اپنے لیے زندہ ہو۔ اس کے برعکس مشترکہ کاشت کا طریقہ ہو تو ایک کا مفاد دوسرے کے مفاد سے وابستہ ہو جائے گا۔ آدمی مل جل کر کام کریں گے۔صرف اپنے لیے زندہ رہنے کے بجائے سب کے لیے زندہ رہیں گے۔ اس عمل سے اس کے اندر اجتماعی ذہنیت پیدا ہوگی۔اس کے اندر یہ احساس ابھرے گا کہ اس کی زندگی پورے سماج کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہی حال ضروریات زندگی سے متعلق دوسری چیزوں کا ہے۔اگر لوگ چیزیں اس لیے بنائیں کہ ان سے اپنی ضروریات پوری کرنی ہیں تو اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔اس کے برعکس اگر چیزیں اس لیے بنائی جانے لگیں کہ ان کو دوسروں کے ہاتھ بیچ کر نفع کمانا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کو لوٹنا چاہتا ہے۔ ہر آدمی اس لیے عمل کر رہا ہے کہ وہ اس عمل کو دوسرے کی جیب خالی کرانے کا ذریعہ بنائے۔ پھر جب قانون ملکیت کے تحت کچھ لوگ زیادہ سرمایہ اکٹھا کر لیتے ہیں تو وہ بڑے بڑے کارخانے کھولتے ہیں جن میں ہزاروں آدمی کام کرتے ہیں۔ اس مرحلہ میں آکر ملکیتی نظام انتہائی شدت اختیار کر لیتا ہے۔اس طرح انسانی محنت کے استحصال کا ایک عظیم سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔اس طریق پیدائش سے افلاس، باہمی نفرت، طبقاتی کش مکش اور

بالآخر انسان اور انسان میں جنگ چھڑ جاتی ہے۔ او برائن (Obrien) نے کہا ہے:

''انسان کی یہ خواہش کہ وہ دوسرے کی محنت سے فائدہ اٹھائے انسانیت کا بنیادی گناہ ہے۔ سب گناہ اسی گناہ سے پیدا ہوتے ہیں۔''

اب اگر سوسائٹی کی مشترک ملکیت کے کارخانے قائم کیے جائیں تو اس میں کام کرتے ہوئے سب کے جذبات یکساں ہوں گے، نہ کوئی مالک ہوگا نہ کوئی مزدور۔ ہر شخص یہ سمجھے گا کہ وہ ایک بڑے خاندان کا ممبر ہے۔ منافع میں سب کو اپنی محنت کا پورا حصہ ملے گا اور باہمی نفرت اونچ نیچ پیدا ہونے کے امکانات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔ اس بناء پر اشترکیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان کی تمام اخلاقی برائیاں اس کے معاشی ماحول کی خرابیوں سے وجود میں آتی ہیں اور اگر نظام معیشت کو درست کر دیا جائے تو اس کے تحت رہنے والے انسان تمام اخلاقی بیماریوں سے پاک ہو جائیں گے۔ اسٹالن نے کہا ہے:

''معاشی ترقی مزدور طبقہ کو سماجی انقلاب کے قریب لے آئے گی اور نتیجہ کے طور پر مزدور طبقہ کو مجبور کرے گی کہ وہ سرمایہ دارانہ نظریات سے تمام رشتے منقطع کر لے۔''

یہی وہ نظریہ ہے جس کے ذریعہ سے مارکس اپنے ''اجتماعی ملکیت'' کے حل کو صحیح ثابت کرتا ہے اور اس بات کی توجیہہ کرتا ہے کہ کیوں پہلے لوٹ کھسوٹ تھی اور کیوں اشترا کی سماج میں نہیں ہوگی۔

یہ نظریہ انسانی ارادہ کی بالکلیہ نفی کر دیتا ہے اور اس کو صرف معاشی حالات کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ اس نظریہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی کی اپنی کوئی ہستی نہیں۔ جس طرح صابن کے کارخانے میں صابن ڈھلتا ہے، اسی طرح آدمی اپنے ماحول کے کارخانے میں ڈھلتا ہے۔ وہ سوچ کر کوئی کام نہیں کرتا بلکہ جو کچھ کرتا ہے اسی کے مطابق سوچنے لگتا ہے۔ مارکس نے اس اصول کو ایک مشکل حل کرنے کے لیے تو لے لیا مگر پھر فوراً سوال پیدا ہوا کہ کیا فی الواقع انسانی فکر معاشی حالات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو خود مارکس کے لیے کیسے ممکن ہوا کہ وہ اپنے وقت کے معاشی حالات کے خلاف سوچ سکے۔ کیا اس نے زمین کا مطالعہ چاند پر جا کر کیا تھا۔ مارکسی نظریہ کے مطابق، انسان اپنے مادی ماحول سے آزاد ہو کر سوچ نہیں سکتا۔ مگر اسی آن جب وہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے موجودہ نظام کی

غلطی معلوم کرلی ہے اور میرے پاس ایک ایسا پروگرام ہے جس کے مطابق، اسے بدل کر دوسرا نیا نظام تعمیر کیا جاسکتا ہے تو مارکس اپنے نظریہ کی آپ تردید کردیتا ہے۔ مارکس ایک طرف تو اپنے کو مصلح کے بجائے سائنسداں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، دوسری طرف یہ نعرہ بھی لگاتا ہے کہ "دنیا کے مزدورو! متّحد ہوجاؤ"۔ یہ الفاظ یقیناً پیشین گوئی نہیں ہیں بلکہ یہ لوگوں کو دعوت عمل ہے۔ اگر مارکس کے نزدیک اشتراکی انقلاب ناگزیر تھا تو اس نے انقلاب کے لانے کی تلقین کیوں کی۔

یہ مارکسی نظریہ کا پہلا کھلا ہوا تضاد ہے۔ کہنے کو تو ایک دعویٰ کردیا گیا مگر پھر تاریخ میں اور روزمرّہ کی زندگی میں ایسے بے شمار واقعات نظر آئے جن کی توجیہہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کی جاسکتی تھی کہ اس کو انسانی ارادہ نے انجام دیا ہے جو ماحول سے الگ انسان کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ مارکس نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تمام اخلاقی تصورات اپنے وقت کے معاشی حالات کا عکس ہوتے ہیں، تمام چیزوں کو بالکل مادہ کے تابع قرار دے دیا۔ اسے ثابت کرنا تھا کہ طریق پیداوار کی ایک شکل آدمی کو ظالم اور ڈاکو بناتی ہے اور اسی کی دوسری شکل آدمی کو عادل اور دیانت دار بناسکتی ہے۔ مگر جب اس تنقید سے فارغ ہوکر مارکسی حضرات نے یہ چاہا کہ پرولتاریہ کو اس مقصد کے لیے منظّم کریں کہ وہ سرمایہ دار طبقہ سے حکومت اور پیدائشی دولت کے ذرائع چھین لے تو انھیں فوراً محسوس ہوا کہ یہاں ان کے پچھلے نظریہ کی نفی ہورہی ہے۔ کیوں کہ اس نظریہ کی رو سے تو انسان محض وقت کے مادّی ہاتھوں میں کھلونا ہے۔ وہ اس کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتا کجا کہ اس کے مقابلے میں منظّم ہو، اور اپنے ارادہ سے رائج الوقت حالات کے بجائے کچھ دوسرے حالات لانے کی کوشش کرے۔ حالانکہ وقت کے خلاف کوئی ذہن کسی ایسے معاشی حالات ہی میں پیدا ہوسکتا ہے جو وقت کے خلاف بنایا گیا ہو۔ مارکسی مفکرین نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے ایک نیا نظریہ گھڑ لیا۔ فریڈرش انگلس لکھتا ہے:

> "تاریخ کے مادّی تصور کی رو سے بنیادی طور پر تاریخ میں فیصلہ کن اہمیت سماجی زندگی کی عملی پیداوار کو ہے۔ اس سے زیادہ نہ تو مارکس نے کبھی کچھ کہا اور نہ میں نے۔ لیکن جب اس کو مسخ کرکے کوئی شخص یہ معنیٰ نکالتا ہے کہ سماج میں معاشی عنصر ہی اکیلا ایک فیصلہ کن

عنصر ہے تو وہ ہمارے اس بیان کو ایک بے معنی مبہم اور لغو جملہ کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اقتصادی حالات تو محض عمارت کی بنیاد ہیں مگر اس سماجی عمارت کے دوسرے حصّے مثلاً طبقاتی جدوجہد کی سیاسی صورتیں اور اس کے نتیجے، فتح مند طبقے کی کامیاب جنگ کے بعد دستور حکومت کی صورتیں، حتیٰ کہ لڑنے والوں کے ذہن میں ان حقیقی لڑائیوں کے اثرات، سیاسی، قانونی، فلسفیانہ نظریے، مذہبی خیالات، وغیرہ ـــــ یہ تمام چیزیں تاریخی جدوجہد کے دوران میں اثر انداز ہوتی رہتی ہیں اور اکثر حالات میں اس جدوجہد کی صورت کو متعین کرنے میں ان کا اثر غالب رہتا ہے[1]۔

دوسری جگہ انگلس لکھتا ہے:

''طبعی علوم اور فلسفہ نے اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا کہ انسان کے مشاغل اور اس کے اعمال اس کی قوت فکر اور طرزِ خیال پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ علوم انسان کو ایک طرف رکھتے ہیں اور فطرت کو دوسری طرف۔ لیکن فطرت میں جو تبدیلیاں انسان خود اپنی سرگرمیوں سے پیدا کرتا ہے وہ انسانی فکر کی لازمی اور حقیقی بنیاد ہیں۔ جتنا اور جس قدر انسان نے خارجی فطرت کو تبدیل کرنے میں کامیابی حاصل کی اسی قدر اس کی عقلی قوت میں ترقی ہوئی۔ تاریخ کا طبیعاتی تصور جو ڈریپر (Draper) اور دوسرے سائنس دانوں کی تحریروں میں ملتا ہے اور جس کی رو سے تنہا خارجی فطرت انسان پر عمل کرتی ہے اور طبعی حالات انسانی تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں، بالکل یک طرفہ ہے۔ اس تصور میں یہ امر فراموش کر دیا گیا ہے کہ انسان بھی فطرت پر عمل کر سکتا ہے، اس پر اثر ڈال سکتا ہے، اور اسے تبدیل کر کے زندگی کے نئے حالات پیدا کر سکتا ہے۔''

مشہور کمیونسٹ مفکر پالکھانو (Palkhanov) لکھتا ہے:

''مارکس کو اپنے مادہ پرست پیش رووٴں سے شکایت تھی کہ انھوں نے اس امر کو نظر انداز

[1] بحوالہ کارل مارکس، سلیکٹڈ ورکس، جلد اول، صفحہ ۳۲۱ (ماسکو ۱۹۴۶ء)

کر دیا کہ اگر ایک طرف آدمی اپنے ماحول کی مخلوق ہے تو دوسری طرف ماحول خود، اس کی کوششوں سے تبدیل ہوسکتا ہے۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق، تاریخی واقعات کی دنیا میں مادیت کا کام یہ ہے کہ وہ اس امر کی تشریح کرے کہ کس طرح ماحول انہی انسانوں کے ہاتھوں میں تبدیل ہوسکتا ہے جو اس کی پیداوار ہے۔''

یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے یہ کہا جائے کہ پتھر بے دماغ بھی ہے اور سوچتا بھی ہے۔ اینٹ اپنے معماروں کے ہاتھ میں کھلونا بھی ہے اور خود اپنے آپ بھی مکان تعمیر کر سکتی ہے۔ زبان وہی بولتی ہے جو دماغ اس سے بولنے کے لیے کہے اور کبھی زبان، دماغ سے الگ ہو کر خود بھی تقریر شروع کر دیتی ہے۔ مگر اس مہمل نظریہ کو ہم کسی بحث کے بغیر تسلیم کر لیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر نظریات وتصورات حالات سے الگ بھی پیدا ہوتے ہیں جو خود بھی حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کو مخصوص ہیئت عطا کرتے ہیں۔ اگر انسان خود بھی فطرت پر عمل کرتا ہے، اس پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسے تبدیل کر سکتا ہے، اگر وہ صرف ماحول کا مخلوق نہیں، بلکہ اس کا خالق بھی ہے تو کس بنیاد پر یقین کیا جائے کہ ذاتی ملکیت کی تنسیخ کے بعد جو معاشی نظام قائم ہوگا اس میں انسان بالکل بدل جائے گا اور لوٹ کھسوٹ کے خیالات اس کے اندر نہیں پیدا ہوں گے۔ جب کہ انسان ماحول سے الگ ہو کر سوچتا ہے اور اس پر اثر انداز ہوسکتا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں آپ سوشلسٹ ریاست کی باگ ڈور عطا کریں، جن کو سارے ملک کی معاشیات کا انچارج بنائیں ان کا ذہن انھیں مفاد پرستی میں مبتلا کر دے۔ وہ موقع پا کر اسی طرح لوٹ کھسوٹ شروع کر دیں جس طرح جمہوری ممالک کے کارخانے دار اور منتظمینِ سلطنت کرتے ہیں۔ جب انسان اپنے ماحول کے مادّی حالات کے خلاف بھی کسی چیز کا ارادہ کر سکتا ہے تو سوشلسٹ طریقِ پیداوار کے متعلق کیسے یقین کر لیا جائے کہ وہ انسان کے طرز فکر اور اس کے اخلاق کو بدل دے گا۔ انسان کی خود فکری تسلیم کر لینے کے بعد آپ کے پاس وہ کون سی دلیل ہے جس کی بنا پر آپ کہہ سکیں کہ سوشلسٹ سماج میں انسان ظلم اور خودغرضی کی بات نہیں سوچے گا اور اختیارات کا غلط استعمال نہ کر سکے گا۔

تاریخ کی ناگزیریت:

مارکسزم کے نزدیک سائنس کے قوانین چاہے وہ فطری سائنس سے متعلق ہوں یا سماجی سائنس سے، سبھی خارجی اعمال کا عکس ہیں جو انسان کی مرضی سے آزاد ہو کر اپنا کام کرتے ہیں، جن کو آدمی نہ تو بدل سکتا ہے اور نہ انھیں مٹا سکتا ہے۔ مثلاً پانی کا یہ اصول ہے کہ اس کو گرم کیا جائے تو ایک خاص مرحلے پر اس کے سالماتی اجزاء منتشر ہو کر اُڑنے لگتے ہیں اور اسی انتشار سے وہ عظیم طاقت پیدا ہوتی ہے جس کو ہم بھاپ کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر اسے ٹھنڈک پہنچائی جائے تو ایک خاص نقطہ پر پہنچ کر وہ جمنے لگتا ہے اور برف کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ایک فطری قانون ہے جس کو معلوم کر کے ہم اسے استعمال تو کر سکتے ہیں مگر اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنا یا اسے مٹا دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ عالم فطرت کے اٹل قوانین ہیں جن کو انسان نے سوچ کر نہیں بنایا، نہ کوئی انسان انھیں بنا سکتا ہے، وہ اپنے آپ قائم ہیں اور ہمیشہ قائم رہیں گے۔ انسان انھیں بدل نہیں سکتا جس طرح وہ سورج اور چاند کی گردش کے نظام کو نہیں بدل سکتا، البتہ ان قوانین کا پتہ لگا کر انھیں اپنے لیے مفید بنا سکتا ہے۔ مارکس کا دعویٰ ہے کہ جس طرح انسان کی پیدائش ایک ایسے قانون طبعی کے تحت ہوتی ہے جس پر اسے کوئی اختیار نہیں ہے، اسی طرح سماج کے بدلنے اور ارتقاء کرنے کے قوانین ''ناگزیر تاریخی وجوب'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پہلے جو کچھ ہوا وہی ہو سکتا تھا اور آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ انسان اپنے ارادہ سے اس میں ردوبدل نہیں کر سکتا۔

مارکس نے یہ نظریہ اس لیے گھڑا تھا تاکہ وہ سرمایہ داری نظام کے ناگزیر تاریخی زوال کی پیشین گوئی کرے اور مزدور طبقہ کو یہ خوش خبری سنائے کہ تاریخی ارتقاء کے اٹل قانون کے مطابق، ان کا عروج لازمی ہے۔ اس نے انسانی تاریخ کو ایسے متعین سفر کی شکل میں پیش کیا جس کے ایک لازمی مرحلہ کے طور پر سرمایہ داری نظام آیا ہے، اور اسی طرح لازمی طور پر اس کے بعد پرولتاری نظام آئے گا۔ مگر سوال پیدا ہوا کہ فطری سائنس کے قوانین تو مستقل ہیں، وہ ہمیشہ ایک حالت پر رہتے ہیں۔ پھر جب تمام نیچر ایک ہے تو جس طرح ہوا اور پانی کے قوانین میں زمانے کی رفتار سے کوئی تبدیلی نہیں آتی، اسی طرح سماج کے قوانین بھی نہیں بدلنے چاہئیں، ان کو ہمیشہ ایک حالت پر باقی رہنا چاہئے۔ یہ بات مارکس کی

خواہش کے خلاف تھی، کیوں کہ اس کے معنی یہ تھے کہ جو کچھ اس وقت موجود ہے، وہی آئندہ بھی باقی رہے۔ مگر وہ تو حالت کو بدلنا چاہتا تھا۔ آج سرمایہ دار طبقہ جس مقام پر ہے، وہاں پرولتاریہ کو لانے کا خواہش مند تھا۔ اس طرح ''سرمایہ داری کے زوال اور پرولتاریہ کے عروج'' کی ناگزیریت ثابت کرنے کے لئے اس نے ایک دعویٰ تو کر دیا مگر پھر فوراً سوال پیدا ہوا کہ یہ ہوگا کیوں کر۔ جب نیچر کے دوسرے قوانین کبھی نہیں بدلتے تو انسانی سماج میں کس طرح تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ پھر تو جس طرح آدمی ہوا میں سانس لینے کے لیے مجبور ہے اور کسی طرح اس کو بدلا نہیں جاسکتا، اسی طرح ملکیتی نظام بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس سوال کے جواب میں مارکس نے فوراً دوسرا دعویٰ کر دیا۔ اس نے کہا ''فطری قوانین کے برعکس سماجی قوانین غیر مستقل ہیں۔'' وہ ایک مخصوص تاریخی عہد میں کام کرتے ہیں جس کے بعد خود انہی کے اندر سے کچھ نئے قوانین نکلتے ہیں جو ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہ قوانین انسانی ارادہ کی تخلیق نہیں ہوتے بلکہ وہ نئے معاشی حالات میں خود بخود جنم لیتے ہیں۔ ایک طرف وہ کائنات کی وحدت کو نہایت زور وشور کے ساتھ بیان کرتا ہے اور دوسری طرف جب اس نظریہ کا اطلاق عملی دنیا میں اس کی خواہش کے خلاف ظاہر ہوتا ہے تو وہ اس سے انکار کر دیتا ہے۔

اس طرح بظاہر مارکس نے اپنی مشکل حل کر لی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کہہ کر اس نے پہلے سے زیادہ بڑی دلدل میں اپنے آپ کو ڈال دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر سماجی ارتقاء کا یہ لازمی قانون ہے کہ ہر دور اپنے اضداد پیدا کرتا ہے جو پہلے سماج کو ختم کر دیتا ہے تو اشتراکی سماج کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوگا۔ کیا پرولتاری انقلاب کے بعد سماج کے غیر مستقل قوانین مستقل ہو جائیں گے اور فطرت اور سماج کا اختلاف ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اس کے معنیٰ تو یہ ہوئے کہ خود اشتراکی سماج کے ساتھ بھی وہی لازمی کمزوری لگی ہوئی ہے جو غلام سماج، جاگیرداری سماج اور سرمایہ داری سماج کے ساتھ تھی۔ جن کی تبدیلی صرف ظلم کی شکلوں کی تبدیلی تھی نہ کہ خود ظلم کی۔ پھر کس بنا پر یقین کیا جائے کہ اشتراکیت کے بعد ''مابعد تاریخی دور'' شروع ہوگا اور انسانیت مستقل طور پر دکھ اور مصیبت سے نجات پا جائے گی۔ اشتراکی حضرات اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اشتراکی سماج چونکہ طبقاتی تضاد سے پاک ہوگا اس لئے

اضداد کا عمل بھی وہاں نہیں ہوگا۔ مگر یہ کوئی دلیل نہیں، کیوں کہ خود مارکسی نظریۂ تاریخ کے مطابق، انسان کا اولین سماج اشتراکی سماج تھا جس میں آج کی طرح طبقات نہ تھے۔ مگر اس کے بطن سے غلام سماج بر آمد ہوا۔ پھر جب گزشتہ تاریخ میں ایسا ہوا تو آئندہ ایسا کیوں نہیں ہوگا۔ ارتقاء کے نظریہ کے مطابق، زندگی کا سفر ہمیشہ ادنی سے اعلیٰ کی طرف ہونا چاہئے مگر ابتدائی معیاری سماج نے اپنے سے بدتر سماج کی طرف کیسے سفر شروع کر دیا۔ اگر اس وقت یہ ممکن تھا کہ خیر سے شر ظاہر ہو تو آئندہ جو سوشلسٹ سماج بنے گا وہ کیوں کسی دوسرے بدترین سماج میں تبدیل نہیں ہوسکتا۔

طبقاتی نظریہ:

مارکس طبقاتی طریق کار میں یقین رکھتا ہے اور ایسے تمام نظریات کا مخالف ہے جو طبقوں کا تصور ختم کر کے ''عوام'' کا تصور پیش کرتے ہیں۔ لینن نے کہا ہے ''غیر طبقاتی اشتراکیت اور غیر طبقاتی سیاست کے تمام نظریئے لغو اور بے معنیٰ ہیں۔'' مارکس کا مطلب بے طبقاتی سماج قائم کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ملکیت رکھنے والے طبقات کو مٹا کر سب کو بے ملکیت بنا دینا چاہتا ہے، یہ کام کسی ایسے ہی گروہ کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے جو اپنے آپ کو ملکیت کی آلائش سے پاک کر چکا ہو۔ ''عوام'' میں ملکیت رکھنے والے اور ملکیت نہ رکھنے والے دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر ایسے مخلوط قسم کے لوگوں کے ذریعہ جو انقلاب آئے گا وہ خالص نہیں ہوسکتا۔ ایسا انقلاب طبقات کو مٹائے گا نہیں بلکہ دوبارہ اس کو قائم کر دے گا۔ اگر آپ کسی گندگی کو دھونا چاہتے ہیں تو اس کی شکل یہی ہے کہ صاف اور بے آمیز پانی سے اسے دھوئیں۔ ایسا پانی جس میں خود بھی وہی گندگی ملی ہوئی ہو، وہ کس طرح دوسری گندگی کو صاف کر سکتا ہے۔

مارکس کو اپنے مقصد کے لیے کسی محروم طبقہ کی تلاش تھی اور وہ مزدوروں کی شکل میں اسے مل گیا۔ وہ کہتا ہے کہ جدید مشینی صنعت نے اسّی فی صدی انسانوں کو ذاتی ملکیت سے محروم کر کے انھیں اپنا اجرتی مزدور بنا لیا ہے۔ یہ لوگ صاحب ملک سرمایہ داروں سے الگ ایک ممتاز طبقہ بن گئے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جن کے پاس سب کچھ ہے اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہی وہ طبقہ ہے جو پوری یکسوئی کے ساتھ ملکیتی نظام کو ختم کرنے کی جنگ لڑ سکتا ہے اور اس کو آخر تک لے

جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یہ خطرہ نہیں ہے کہ ملکیت کی تنسیخ سے اس کا اپنا بھی کچھ نقصان ہوگا۔ مارکس کے الفاظ میں ''جدید محنت کش طبقہ کے پاس اپنی بیڑیوں کے سوا کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے[1]۔''

ایک کمیونسٹ مفکر لکھتا ہے:

> ''مارکس کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے مزدور طبقہ کا وہ فرض دریافت کیا جو تاریخ نے اس طبقہ کو سونپا تھا مارکس نے بتایا کہ یہی طبقہ سرمایہ داری کی قبر کھودے گا اور سوشلزم کی عمارت اٹھائے گا۔ مارکسزم کا نظریہ ہے کہ محنت کرنے والے اور اپنی محنت سے دوسروں کو نفع دینے والے عوام میں صرف مزدوروں کا طبقہ ایسا ہے جو آخر حد تک انقلابی ہے۔ وہ نجی ملکیت کے بندھن سے آزاد ہے۔''

یہی مصنف دوسری جگہ لکھتا ہے:

> ''طبقاتی تقسیم پر اس لیے زور دیا جاتا ہے کہ مارکسزم کے مطابق، مزدور طبقہ آدھے راستے پر ستانے کا قائل نہیں۔ اس میں وہ تذبذب اور ارادے کی کمزوری نہیں جو درمیانی طبقوں کی خصوصیت ہے۔ اس میں ہر طبقہ سے زیادہ جوش اور جذبہ پایا جاتا ہے۔''

مارکس کا یہ نظریہ، سماجی ارتقاء کے بارے میں اس کے نظریہ کے مطابق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سماج جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے خود اس کا ضد پیدا ہو جاتا ہے جو اسے ختم کر دیتا ہے۔ سرمایہ داری ایک ملکیتی نظام ہے یہ اپنی ترقی کے دوران میں بہت بڑی اکثریت کو ملکیت سے محروم کر کے صرف اجرتی مزدور بنا دیتا ہے۔ یہی بے ملکیت مزدور صاحب ملک سرمایہ داری کے بطن سے نکلا ہوا اس کا وہ حریف ہے جو اس سے ٹکرا کر اسے ختم کر دے گا۔ مارکس نے یورپ کے ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے پیش نظر یہ بات کہی تھی۔ اس کے فلسفہ کے مطابق، کمیونزم سب سے پہلے وہاں آنا چاہئے تھا جہاں سرمایہ داری نظام سب سے زیادہ ترقی کر چکا ہو، کیوں کہ جہاں صنعتی نظام زیادہ ترقی کر لیتا ہے وہیں اس کا ضد ــــ بے ملکیت مزدوروں کا گروہ ــــ پیدا ہوتا ہے جو اسے ختم کر سکتا ہے۔ مگر اس کا یہ نظریہ غلط

---

[1] اشتراکی منشور

ثابت ہوا اور کمیونزم سب سے پہلے روس میں پھیلا۔ روس ایک زراعتی ملک تھا، وہاں مزدوروں کی آبادی کا تناسب اس کے برعکس تھا جو مارکسی نظریے کے مطابق، انقلاب کے قابل کسی ملک میں ہونا چاہئے۔ روس میں مزدوروں کی تعداد ساری آبادی میں ایک جزوی حیثیت رکھتی تھی، اور اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو انفرادی طور پر زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعات میں کاشت کرتے تھے۔ جنھیں بعد کو لینن نے ''امکانی سرمایہ دار'' کا لقب دیا۔ وہاں ابھی وہ طبقاتی تضاد پیدا نہیں ہوا تھا جو اشتراکی انقلاب کا سبب ہوا کرتا ہے۔ روس ابھی پورے طور پر صنعتی ملک نہیں بنا تھا اور وہاں زیادہ تر صاحب ملک جاگیردار کے مقابلے میں چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی ملکیت والے کسان تھے۔ اس طرح اس کے اشتراکی نظام کے درمیان ابھی پورے ''ایک دور'' کا فاصلہ تھا۔ روس ابھی جاگیرداری نظام کے سرے پر تھا، جب کہ مارکسی فلسفہ کے مطابق اس کو اشتراکیت تک پہنچنے کے لیے سرمایہ داری نظام کی منزل عبور کرنی بھی ضروری تھی۔ دوسرے لفظوں میں، روس میں ابھی وہ حالات ہی پیدا نہ ہوئے تھے کہ وہاں دو متضاد طبقے ٹکرا جائیں اور انقلاب رونما ہو۔ چنانچہ دوسری انٹرنیشنل کے اکثر ممبروں کی رائے کہ ''کسی ملک میں مزدور طبقہ اس وقت تک اقتدار حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اسے کرنا چاہئیے جب تک اس ملک میں اس کی اکثریت نہ ہو جائے۔'' اس کے جواب میں لینن نے کہا:

> ''مانا کہ تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے، لیکن فرض کرو، ایک ایسی تاریخی صورت حال (جنگ، زراعتی بحران، وغیرہ) پیدا ہو گئی ہے جس میں مزدور طبقہ کو جو ملک میں اقلیت میں ہے یہ موقع مل گیا ہے کہ محنت کش عوام کی وسیع اکثریت کو اپنے ساتھ لے کر اقتدار پر قبضہ کر لے تو وہ کیوں نہ ایسا کرے[1]۔''

اس توجیہہ کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مارکسی انقلاب کی حیثیت تاریخ کے ان انقلابات سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جس میں ایک ظالم حکمراں نے کسی ملک کی حکومت کو کمزور پا کر اس پر قبضہ کر لیا۔ حالاں کہ تاریخ کے اس نقطۂ نظر کو مارکسی حضرات بورژوا تاریخ کہتے ہیں۔ مارکس نے

---

[1] اسٹالن، پرابلمز آف لینن ازم، صفحہ ۲۲۔

مزدور انقلاب کو ملک گیری اور لوٹ کھسوٹ کے انقلاب سے الگ کرنے کے لیے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ انسان کی تاریخ ایک لازمی قانون ارتقاء کے تحت سفر کر رہی ہے۔غلام سماج سے جاگیرداری سماج ہی پیدا ہوسکتا تھا اور جاگیرداری سماج صرف سرمایہ دارانہ سماج پیدا کرسکتا تھا۔اسی طرح سرمایہ دارانہ سماج سے اشتراکی سماج ہی پیدا ہوسکتا ہے۔لینن نے اپنے مضمون ''مارکس کی تعلیمات''میں لکھا ہے:

''مارکس نے تمام تر موجودہ سماج کے معاشی قانونِ حرکت سے ہی یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ سرمایہ دارانہ سماج کا اشتراکی سماج میں بدل جانا ضروری ہے۔محنت نت نئی تیزی سے ہزاروں صورتوں میں اشتراکی رنگ اختیار کرتی جارہی ہے۔مزدور طبقہ جس نے خود سرمایہ داری کے ہاتھوں تربیت پائی ہے، اس تبدیلی کی ذہنی اور اخلاقی روحِ رواں ہے اور وہی اس کو عملی جامہ پہنائے گا[1]''

انقلابات کی عام تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کسی ملک کی حکومت کمزور ہوگئی یا وہاں کے مختلف علاقے آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہوکر لڑنے لگے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کسی نے اپنی فوج کے ساتھ اس پر چڑھائی کردی اور سارے ملک پر قبضہ کرلیا اور جہاں سابق ظالموں کی حکمرانی تھی وہاں نئے ظالموں کی حکمرانی قائم ہوگئی۔لیکن مارکس نے اشتراکی انقلاب کو اس قسم کی ملک گیری سے ممتاز کرنے کے لیے بالکل ایک نیا تاریخی نظریہ قائم کیا۔اس نے کہا کہ سماج کے انقلابات کسی خارجی ارادہ کے تحت واقع نہیں ہوتے بلکہ ان کی ایک اندرونی منطق ہے جو اسے ارتقاء کی طرف لے جارہی ہے۔ اب تک کے انقلابات منصفانہ سماج قائم کرنے میں اس لیے ناکام رہے کہ اب تک کوئی ایسا طبقہ پیدا نہیں ہوا تھا جو صحیح طور پر انقلاب کی رہنمائی کرسکے۔مگر جدید سرمایہ داری نظام نے بے ملک مزدوروں کا طبقہ پیدا کرکے یہ کام انجام دے دیا ہے۔یہ بے ملک مزدور وہ گروہ ہے جو ظلم کے اصل سبب یعنی ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت سے پاک ہے۔اس لیے اس کے ہاتھوں جو انقلاب آئے گا وہ خالص انقلاب ہوگا اور وہ اپنے کو آزاد کرنے کے ساتھ دوسروں کو بھی آزاد کردے گا۔اس طرح اس نے فلسفۂ تاریخ کے ذریعہ اس بات کی توجیہہ کی کہ پچھلے انقلابات کے برعکس کیوں مزدور انقلاب خوش حالی اور انصاف کا

---

[1] کارل مارکس سلکٹڈ ورکس جلد اول صفحات ۳۶۔۳۷

انقلاب ہوگا۔لیکن واقعات سے ٹکرانے کے بعد جب یہ نظریہ بے معنیٰ معلوم ہوا تو فوراً اس کی توجیہہ کر لی گئی۔مگر توجیہہ کرنے والے یہ بھول گئے کہ اس توجیہہ سے وہ خود اپنے خلاف دلیل فراہم کر رہے ہیں۔سوال یہ ہے کہ سرمایہ داری نظام کی کمزوری کیا اس کا نام ہے کہ کسی وقتی سبب سے کسی ملک میں اس کی گرفت کمزور ہوگئی ہو یا یہ کہ مارکس کے فلسفۂ اضداد کے مطابق، اس کے بطن سے اس کا وہ مخالف عدو ظاہر ہو جائے جو اس کو بالکل طبعی نتیجہ کے طور پر ختم کر سکتا ہے۔اگر پہلی صورت ہے تو مارکس کا مادی تاریخ کا فلسفہ کہاں گیا۔پھر تو اشتراکی انقلاب کسی ارتقائی عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ بھی اس نوعیت کی ایک چیز ہے جیسے ہٹلر نے موقع پا کر پولینڈ پر قبضہ کر لیا یا مسولینی نے حبشہ کی کمزور حیثیت سے فائدہ اٹھا کر اس پر اپنی حکومت قائم کر دی۔پھر پرولتاری انقلاب اور ظالمانہ ملک گیری میں کیا فرق باقی رہتا ہے۔

روس میں جب لینن نے انقلاب کی جدوجہد میں بے ملکیت مزدوروں کے ساتھ صاحب جائداد کسانوں کو بھی شریک کیا تو وہاں بڑے زور و شور کے ساتھ یہ سوال اٹھا کہ اس قسم کی جدوجہد کے ذریعہ جو انقلاب آئے گا کیا وہ اشتراکی انقلاب ہو سکتا ہے۔اسی ''عوامی کردار'' کی وجہ سے فرانس کا جمہوری انقلاب سرمایہ داری کے انقلاب میں تبدیل ہو گیا اور جو طاقت بادشاہ سے چھینی گئی تھی وہ محنت کش عوام کی طرف منتقل ہونے کے بجائے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔آخر روس میں بھی کیوں ایسا نہیں ہوگا جب کہ یہاں بھی مزدوروں کے خالص بے ملکیت طبقہ کے بجائے ملے جلے عوام کے ذریعہ انقلاب لایا گیا ہے۔

اس کے جواب میں لینن نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کبھی ''بورژوا جمہوری انقلاب بڑھ کر سوشلسٹ انقلاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔'' اس نے روسی انقلاب کے دو دور قرار دیئے۔ایک فروری ۱۹۱۷ سے اکتوبر ۱۹۱۷ تک (۸ مہینے) جب کہ ''تمام کسانوں کو ساتھ لے کر ملوکیت کے خلاف زمینداروں کے خلاف، جاگیرداری نظام کے خلاف'' جدوجہد کی گئی۔یہ جاگیرداری نظام سے سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب تک پہنچنے کی منزل تھی۔اس دور میں زار کو ختم کیا گیا اور ملک میں عوام کی نمائندہ آزاد جمہوری حکومت قائم کی گئی۔دوسرا اکتوبر ۱۹۱۷ کے بعد جب کہ ''مفلس کسانوں اور نیم مزدوروں اور تمام

مظلوموں کو ساتھ لے کر سرمایہ داروں کے خلاف جدوجہد کی گئی، جس میں دیہات کے امراء، دولت مند کسان اور نفع خور بھی شامل ہیں۔'' اس دوسرے دور میں روسی انقلاب سوشلسٹ انقلاب بنا، جب کہ اقتدار براہ راست محنت کش طبقہ یعنی بالشویک پارٹی کے ہاتھ میں آ گیا۔

مگر اس منطقی تاویل سے بھی کام نہ چلا، کیوں کہ پہلے دور میں روس میں جو انقلاب آیا تھا اس کی حیثیت صرف یہ تھی کہ ملک کا اقتدار اعلیٰ زار کے بجائے عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ جیسا کہ عام طور پر جمہوری ممالک میں ہوا ہے۔ یہ محض ایک سیاسی نوعیت کی تبدیلی تھی۔ حالانکہ مارکس اور انگلز کی واضح تصریحات کے مطابق، اشتراکی انقلاب معاشی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اشتراکی پیغمبروں کی ان تحریروں کو بدل دینا ممکن نہ تھا جن کا صریح تقاضا یہ ہے کہ اشتراکی انقلاب سب سے پہلے انھیں ملکوں میں آئے جہاں جدید سرمایہ داری نظام سب سے زیادہ ترقی کر چکا ہو۔ کیوں کہ سرمایہ داری کا ضد ــــ بے ملک مزدوروں کی فوج وہیں پائی جاسکتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق، اشتراکی انقلاب کی توقع سب سے پہلے مغربی یورپ ہی کے کسی ملک میں کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ کمیونسٹ مینی فسٹو جو ۱۸۴۸ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں سب سے پہلے جس ملک میں اشتراکی انقلاب کی امید ظاہر کی گئی تھی وہ جرمنی ہے۔ مارکس نے مئی ۱۸۴۹ء میں اپنے اخبار ''جدید رائیں گزٹ'' میں لکھا تھا کہ ''سُرخ جمہوریت پیرس کے اوپر جھانک رہی ہے۔'' مگر اشتراکی انقلاب نہ جرمنی میں آیا، نہ فرانس میں، نہ برطانیہ میں اور نہ امریکہ میں بلکہ وہ روس میں ہوا۔ یہ ایک مشکل سوال تھا جس کی توجیہہ کے لیے لینن کے ''سامراجیت'' کے نظریے سے مدد لی گئی۔ کہا گیا کہ مارکس نے جس سرمایہ داری نظام کو سامنے رکھ کر اس کی تشریح کی تھی وہ اب سامراجی دور میں داخل ہوگئی ہے۔ یہ سرمایہ داری نظام کا قومی اور ملکی حدود سے نکل کر عالم گیر نظام کی شکل اختیار کر لینے کا دور ہے۔ اب صنعتی ممالک صرف اپنی مصنوعات باہر نہیں بھیجتے بلکہ نو آبادیات قائم کر کے سرمایہ باہر منتقل کرتے ہیں۔ اس طرح نو آبادیاتی پالیسی کے ساتھ مل کر یہ مالیاتی پھیلاؤ ایک ایسا عالم گیر نظام بن گیا ہے جس میں گنتی کے چند ''ترقی یافتہ'' ممالک دنیا کی کثیر آبادی پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ان باتوں کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ الگ الگ قومی علاقے اور قومی معیشت ایک ہی

عالم گیر معیشت کے سلسلہ کی کڑیاں بن گئی ہیں۔ پہلے لوگ سمجھتے تھے کہ مزدور انقلاب محض کسی ایک ملک کی اندرونی ترقی کا نتیجہ ہے۔ اب یہ نقطۂ نظر کافی نہیں رہا۔ اب سمجھنا چاہئے کہ مزدور انقلابات اصل میں سامراجیت کے عالم گیر اندرونی تضاد کے بڑھنے یا کسی ملک میں عالم گیر سامراجی محاذ کی زنجیر ٹوٹ جانے کا نتیجہ ہے۔'' اس نظریے کے تحت لینن نے اعلان کیا کہ '' یہ ضروری نہیں ہے کہ انقلاب سب سے پہلے اس ملک میں آئے جہاں صنعت زیادہ ترقی کر چکی ہے۔ سرمایہ کا مورچہ سب سے پہلے وہیں ٹوٹے گا جہاں سامراجیت کی زنجیر سب سے کمزور ہے۔'' چنانچہ اس اصول کے مطابق، اسٹالن لکھتا ہے کہ '' ۱۹۱۷ میں عالم گیر سامراجی محاذ کی زنجیر اور ملکوں کی بہ نسبت روس میں زیادہ کمزور ثابت ہوئی، وہیں زنجیر ٹوٹ گئی اور مزدور انقلاب کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔''

ان تفصیلات کا ذکر کرنے کے بعد اسٹالن لکھتا ہے:

'' یہی وجہ ہے کہ مزدور انقلاب کے مسئلہ کا فیصلہ کرنے میں کسی ملک میں مزدوروں کی آبادی کے اعداد وشمار کی اب وہ اہمیت نہیں رہی جس پر دوسری انٹرنیشنل کے کتاب پرست اس قدر زور دیا کرتے ہیں۔ وہ سامراجیت کو نہیں سمجھ سکے اور انقلاب سے طاعون کی طرح ڈرتے ہیں[1]۔''

مگر مارکسی حضرات اس کی کیا توجیہہ کریں گے کہ سامراجی نظام کا نوآبادیاتی پھیلاؤ دوبارہ قومی سرمایہ داری کی حدود میں سمٹ آیا ہے۔ لینن نے کہا تھا کہ '' سامراجیت سوشلسٹ انقلابات سے پہلے کی شام ہے۔'' اس نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے '' سامراجیت ـــــ سرمایہ داری کی آخری منزل۔''

مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہو چکا ہے، اور سامراجیت کی تاریکی سوشلسٹ انقلاب کی شکل میں طلوع ہونے کے بجائے '' قومی سرمایہ داری '' کی صبح میں تبدیل ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ خود روس بھی اب عالم گیر مزدور تحریک کا مرکز نہیں رہا بلکہ اشتراکیت کا '' مادر وطن '' بن گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ مارکسی حضرات اب کوئی اور نظریہ گھڑیں۔

---

[1] دیکھو اسٹالن کی کتاب '' پرابلمز آف لینن ازم ''، صفحہ ۳۰۔۳۵ (ماسکو ۱۹۴۷ء)

متضاد باتیں:

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، مارکسزم ڈارون اور اس کے خلفاء کے مرتب کردہ نظریہ ارتقاء کو تسلیم کرتی ہے، اور واقعات عالم کی توجیہہ کے لیے اسی نظریہ کو استعمال کرتی ہے۔ کارل مارکس نے ڈارون کی مشہور کتاب ''آغاز انواع'' کا مطالعہ کرنے کے بعد فریڈرش انگلس کو لکھا تھا کہ ڈارون کی تحقیق سے ہمارے جدلیاتی نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ مگر قدیم ڈارو ینی نظریہ کا ایک پہلو چونکہ اس کے طبقاتی جدوجہد کے نظریہ سے ٹکراتا تھا اس لیے مارکس نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ڈارون اور اس کے ہم خیال سائنس دانوں کا دعویٰ تھا کہ قانون ارتقاء کے مطابق، فطرت میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ ہمیشہ تدریجاً عمل میں آتی ہیں اور فطرت کا تسلسل کہیں بھی ٹوٹتا نہیں ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ فطرت میں کوئی تغیر اچانک واقع ہو جائے۔ مگر ایسا ماننے کی صورت میں مارکس کے انقلابی نظریہ کی تردید ہوتی تھی۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ فطرت کے سارے تغیرات اپنے آپ ہو رہے ہیں۔ ڈارون کو تدریجی ارتقاء کا اصول گھڑنا پڑا تھا۔ یعنی کسی خارجی کارفرمائی کے بغیر کائنات کے تمام مظاہر تدریجی ارتقاء سے مسلسل بڑھ رہے ہیں۔ مگر مارکس، ''مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ'' قائم کرنے کے لیے اس کا انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا کہ سرمایہ داری کسی تدریجی عمل کے ذریعہ خود سے فنا ہو جائے اور مزدور راج بھی ایک تدریجی عمل کے ذریعہ نامعلوم مدت میں خود بخود قائم ہو جائے۔ وہ تو انقلاب کا داعی تھا۔ ایک سوسائٹی کو توڑ کر فوراً دوسری سوسائٹی قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے قدیم ڈارو ینی نظریے کے اس پہلو کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ فطرت میں اچانک تغیر بھی ہوتا ہے۔ یعنی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فطرت تدریج و تسلسل سے کام لینے کے بجائے ایک جست لگا کر آگے بڑھ جاتی ہے اور کسی ایسی شئے یا ذی حیات ہستی کو وجود میں لاتی ہے جو شکل اور صفت دونوں اعتبار سے اپنے پیش روؤں سے بالکل مختلف ہوتا ہے[1]۔ یقیناً عالم فطرت میں ایسے تغیرات ہوتے ہیں جیسا کہ جدید تحقیقات سے بھی ثابت ہوا ہے۔ مگر اس کو مان لینے کے بعد پھر مارکس کے دوسرے نظریات کی عمارت دھڑام سے گر

---

[1] کارل مارکس، سلیکٹڈ ورکس، جلد اول، صفحہ ۷۱

جاتی ہے۔ ہیگل نے بھی کہا تھا کہ اس مفہوم میں نظریہ ارتقاء بالکل مہمل ہے۔ مگر ہیگل عالم مادی کے پیچھے ایک متصرف طاقت مانتا ہے۔ ایک شعور جو جان بوجھ کر عالم مادی کو حرکت دے رہا ہے۔ ایسی صورت میں تو یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عالم فطرت میں اچانک تغیرات واقع ہوتے ہیں اور ان تغیرات کو وقوع میں لانے والا وہ شعور ہوتا ہے جو کائنات کے پیچھے بالا رادہ کام کر رہا ہے۔ مگر مارکس تو ایسی کسی طاقت کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ پھر وہ اس کی کیا توجیہ کرے گا۔ اچانک تغیرات قطعی طور پر کسی متصرف شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ سماج میں جو اچانک تغیر مارکس لانا چاہتا ہے وہ خود بخود ہونے والا کوئی عمل نہیں ہے بلکہ پرولتاری طبقہ اس کو بالقصد سرمایہ داروں سے کش مکش کر کے وجود میں لاتا ہے۔ پھر کائنات کے تغیرات لانے والا کون ہے۔

مگر مارکسی حضرات کی مشکل یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اشترا کی فلسفہ کی مثال ایک الجھے ہوئے دھاگے کی ہے جس میں بے شمار گرہیں پڑی ہوئی ہیں اور ہر بار گرہ کھولنے کی کوشش اس میں کچھ اور گرہوں کا اضافہ کر دیتی ہو۔ جب روس میں پہلی بار عملاً یہ نظریہ رائج ہوا تو ایک اور مشکل پیش آ گئی ''فطرت کبھی چھلانگ لگا کر ایک حالت سے دوسری حالت تک پہنچ جاتی ہے''۔ اس اصول سے کام لے کر محنت کش طبقہ کو سرمایہ دار طبقہ سے ٹکرایا گیا تھا تا کہ رائج الوقت نظام اپنا تسلسل توڑ کر اشترا کی نظام میں تبدیل ہو جائے۔ اس نظریہ کی رو سے اکتوبر انقلاب کے بعد روس میں حقیقی معنوں میں سوشلزم قائم ہو جانا چاہئے تھا اور لوٹ کھسوٹ اور طبقاتی جنگ کا وجود مٹ جانا چاہئے تھا۔ مادی حالات کی تبدیلی سے سماجی حالات بدل جانے پر اشترا کی حضرات علم کیمیا سے استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً آکسیجن کے سالمات (Molecules) میں دو جوہر (Atoms) ہوتے ہیں۔ اگر کسی عمل کے ذریعہ ان کی تعداد تین کر دی جائے تو وہ آکسیجن باقی نہ رہے گا بلکہ اوزون (Ozone) بن جائے گا جو بُو اور خاصیت دونوں میں آکسیجن سے مختلف ہے۔ اس استدلال کے معنی یہ ہیں کہ زار کی حکومت کا تختہ الٹ جانے کے بعد جب مزدور طبقہ نے اقتدار سنبھال لیا تو فوراً اشترا کی طرز کا بے طبقاتی سماج قائم ہو جانا چاہئے تھا۔ کیوں کہ آکسیجن میں جب مطلوبہ قسم کی مادی تبدیلیاں کر دی جائیں تو وہ پورے طور پر

اوزون ہو جائے گا نہ کہ پھر بھی آکسیجن باقی رہے گا، مگر روس میں ایسا نہ ہوسکا۔ انقلاب کے بعد شروع شروع میں انقلابی حضرات اپنے جوش میں یہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب ان کے خوابوں کی دنیا آ گئی ہے۔ اب یہاں نہ کوئی لوٹنے والا ہے، نہ کوئی لٹنے والا، نہ کوئی ظالم ہے، نہ کوئی مظلوم، نہ کوئی دبا ہوا طبقہ ہے، نہ کوئی دبانے والا طبقہ۔ مگر بہت جلد معلوم ہوگیا کہ مادی حالات کے بدل جانے کے بعد بھی ''بے طبقاتی سماج'' کا خواب پورا نہیں ہوا ہے بلکہ حکومت کے ہاتھ میں سیاسی طاقت کے ساتھ سارے ملک کی معاشیات آجانے کی وجہ سے مظلوم کی مظلومیت اور ظالم کا ظلم دونوں بہت بڑھ گئے ہیں۔ فوج اور پولیس کی سرگرمیاں زار کے زمانہ سے بھی زیادہ شدید ہوگئی ہیں۔ رہی سہی آزادیوں کا بھی خاتمہ ہوگیا ہے۔ زندگی ہر طرف افلاس، مجبوری اور ہولناک مظالم کا شکار ہو رہی ہے۔ یہ کھلا ہوا ثبوت اس بات کا تھا کہ علم کیمیا کے قوانین انسانی زندگی پر راست نہیں آتے۔ ایک عنصر ایٹمی تبدیلیوں کے ذریعہ دوسرے عنصر میں تبدیل ہوسکتا ہے لیکن انسان کا ذہن اگر نہ بدلے تو ماڈی حالات اس کو بدل نہیں سکتے۔ ایک راستہ نہ پا کر وہ اپنے ارادہ کی تکمیل کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرلے گا۔ چنانچہ روس میں جب سوشلسٹ ریاست قائم ہونے کے بعد بھی جابرانہ کارروائیاں باقی رہیں، بلکہ زار کے زمانہ سے بھی زیادہ سخت ہوگئیں تو اس کو دیکھ کر خود بڑے بڑے کمیونسٹ چیخ اٹھے۔ مزدور انقلاب ''جست'' لگانے کی کوشش میں شاید کھائی کے اندر جا گرا تھا۔ مگر اشترا کی حضرات کب اپنی ہار ماننے والے تھے، انھوں نے فوراً ایک نظریہ گھڑ لیا۔ لینن نے اعلان کیا:

> ''جب دوسروں کی محنت سے منافع حاصل کرنے والوں کا تختہ الٹ دیا جائے تو طبقاتی کش مکش ختم نہیں ہوتی بلکہ تیز تر ہو جاتی ہے''۔

گویا سرمایہ داروں کو بے دخل کرنے کے وقت تک تو ''چھلانگ'' کا اصول تھا اور اس کے بعد پھر حسب سابق ''تدریج'' کا۔ اس طرح لینن نے ایک طرف تو اس مشکل کو حل کیا کہ انقلاب کے بعد بھی کیوں حالات نہیں بدلے۔ دوسرے اس بات کی توجیہہ کی کہ مزدور انقلاب کے بعد بھی کیوں کمیونسٹ ڈکٹیٹر شپ کو گولیوں اور جیل خانوں کے استعمال کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ اس حالت پر روس میں

اب تقریباً آدھی صدی گزر چکی ہے۔ کتنے لوگ پیدا ہوئے اور مر گئے، کتنی آنکھیں کھلیں اور بند ہو گئیں۔ مگر طبقاتی کش مکش ہے کہ تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ جو کش مکش زار کے خلاف شروع ہوئی تھی، وہ نہ کرنسکی پر رکی، نہ ٹراٹسکی پر۔ اس کا خاتمہ نہ بیریا پر ہوا، نہ مولوٹوف پر۔ وہ نہ مالنکوف پر ختم ہوئی، نہ ملگا ئین پر۔ یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس کی ابتداء کی تاریخ متعین کی جا سکتی ہے مگر انتہا کی نہیں۔ کمیونسٹ حضرات بتائیں کہ روس کا بے طبقاتی سماج تدریج کے اصول پر سفر کر رہا ہے یا ''چھلانگ'' لگانے میں مصروف ہے۔ اگر تدریج ہے تو وہ کتنی لمبی ہے اور اگر چھلانگ ہے تو وہ کیسی چھلانگ ہے کہ اس نے ابھی تک ارتقاء کی منزل عبور نہیں کی۔ جاگیرداری سماج سے سرمایہ دارانہ جمہوریت تک پورے ایک دور کو روس نے صرف آٹھ مہینے میں چھلانگ لگا کر عبور کر لیا تھا۔ مگر طبقاتی سماج سے بے طبقاتی سماج تک پہنچنے کی منزل آدھی صدی میں بھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

سماجی ارتقاء کا نظریہ:

اوپر ہم نے جو گفتگو کی ہے، اس سے مارکسی فلسفہ کی دو بنیادوں کی حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ اس بحث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ انسانی تاریخ کے متعلق یہ مفروضہ غلط ہے کہ اس کا کوئی لازمی قانون ہے اور اسی طرح یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ سماجی حالات کو محض معاشی قوانین کی تبدیلی سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اب ہم مارکس کے سماجی ارتقاء کے نظریہ پر گفتگو کریں گے۔

انسانی زندگی کا یہ ایک اہم سوال ہے کہ سماج کو بہتر طور پر منظّم کرنے کے اصول کہاں سے لیے جائیں۔ اس کی خرابیوں کو کس طرح خوبیوں سے بدلا جائے۔ اس کے جواب میں مارکس نے فلسفۂ ارتقاء کا سہارا لیا۔ اس نے کہا کہ جس طرح طبعی دنیا میں تمام چیزیں خود بخود ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف ترقی کر رہی ہیں۔ اسی طرح انسانی سماج بھی ایک تاریخی عمل کے تحت ارتقاء کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اسی بناء پر مارکسزم کو سماجی حرکت کی سائنس (social dynamics) کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ علم جو سماج کے سفر ارتقاء کی تشریح کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مارکس کے اس نظریہ کے بعد انسانی تاریخ راجا رانی کی کہانی نہیں رہی بلکہ اس نے باقاعدہ ایک سائنس کی شکل اختیار کر لی ہے۔

مارکس کے ''سائنٹیفک نقطۂ نظر'' کے مطابق، طبعی دنیا کی طرح انسانی سماج بھی ارتقاء کے راستہ پر بڑھ رہا ہے اور اس میں مسلسل ترقی ہو رہی ہے۔ سوشلسٹ تحریکیں اور سرمایہ دارانہ ممالک میں سوشلسٹ انقلاب اس ارتقائی سفر کے نشانات ہیں جو سماج کو بدتر حالت سے بہتر حالت کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یہ گویا اس نظریہ کی تردید تھی کہ سماج کی اصلاح اور اس کے صحیح قوانین کی دریافت کے لیے ''وحی الٰہی'' کی ضرورت ہے اس لیے ثابت کیا کہ کسی خارجی کارفرمائی کے بغیر ہمارا سماج خود اپنی اندرونی منطق سے ارتقاء کر رہا ہے، اس کا ہر قدم لازمی طور پر آگے کی طرف ہوتا ہے اور وہ برابر صحیح سمت کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ مگر پچھلی ایک صدی کی تاریخ اس نظریہ کی تردید کرتی ہے۔

سوشلزم کی مثال لیجیے جو مارکسی فلسفہ کے مطابق، تاریخ کا ایک نمایاں ارتقائی قدم ہے۔ یہ سوشلزم مارکس کی ایجاد نہیں ہے۔ اس سے بہت پہلے سوشلسٹ تصورات یورپ میں پیدا ہو چکے تھے۔ مگر مارکسی حضرات کے نزدیک یہ ناقص سوشلزم تھا جس کو مارکس نے مکمل کیا ہے۔ اس زمانہ میں سوشلزم کے معنی یہ تھے کہ سرمایہ دار طبقہ سے اپیل کر کے اس کو مزدوروں کے ساتھ بہتر معاملہ کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ پر امن جدوجہد کے ذریعہ معاشی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس زمانہ کے سوشلسٹ مفکرین کا مقصد صرف مزدور طبقہ کو آزاد کرنا نہیں تھا بلکہ ساری نوع انسانی کی آزادی ان کے پیش نظر تھی۔ وہ مزدور اور کارخانہ دار کو باہم ٹکرانے کے بجائے ان کی باہمی کشمکش کو ختم کرنے کے خواہش مند تھے۔ وہ ذرائع پیداوار پر مکمل ریاستی کنٹرول قائم کرنے کے حق میں نہیں تھے بلکہ صرف اس کے بعض حصوں کو قومی ملکیت میں لینا چاہتے تھے۔ وہ ''مزدور طبقہ کی ڈکٹیٹر شپ'' کے بجائے سارے عوام کی جمہوری حکومت میں یقین رکھتے تھے۔ وہ عالمی انقلاب کے بجائے قومی سوشلزم کے علم بردار تھے۔ وہ مذہب و اخلاق کے مخالف نہیں تھے بلکہ اس کو انسانیت کا قیمتی سرمایہ سمجھتے تھے۔

مگر ان نظریات کو مارکس نے باطل ٹھہرایا۔ سوشلزم کے ان تصورات کو اس نے بورژوا اور خیالی سوشلزم کہا۔ اس نے کہا کہ یہ سوشلزم کے نام پر رجعت پسندی کو اختیار کرنا ہے۔ اس نے بتایا کہ سرمایہ دار اور مزدور میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا ایک دوسرے سے ٹکرانا ضروری ہے تا کہ سرمایہ

دار طبقہ فنا ہو جائے اور مزدور طبقہ کو سارے اختیارات حاصل ہو جائیں ۔ وہ پرامن اور آئینی ذریعہ سے کام کرنے کو موقع پرستی کہتا ہے۔ اس کے نزدیک صحیح طریق کار صرف یہ ہے کہ قوت سے کام لے کر سرمایہ داری نظام کو توڑ پھوڑ ڈالا جائے۔ اس نے عوامی حکومت کا مذاق اڑایا اور اس کو بدلے ہوئے نام کے ساتھ سرمایہ داروں کی حکومت بتایا۔ اس کے نزدیک انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مزدور طبقہ کی حکومت قائم ہو، نہ کہ ''عوام'' کی جس کے درحقیقت کوئی معنی نہیں، وہ مزدور اور کارخانہ دار کی کش مکش کو کم کرنا نہیں چاہتا بلکہ اس کو آخری حد تک تیز کر دینا چاہتا ہے تاکہ جس کو مٹنا ہے وہ مٹ جائے اور جس کے لیے زندہ رہنا مقدر ہے اسے زندگی حاصل ہو ـــــ اس نے کہا کہ محض بعض چیزوں پر ریاستی کنٹرول قائم کر دینے سے کام نہیں چلتا۔ پیدائشی دولت کے تمام ذرائع پر مکمل ریاستی کنٹرول ہونا چاہئے۔ لینن کے الفاظ میں ایک کسان کو اگر چند بیگھے زمین کے ساتھ باقی رکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ابھی زمین پر ''امکانی سرمایہ دار'' موجود ہے۔ اس نے قومیت کو استحصال کرنے والے طبقہ کا فریب بتایا اور ایک عالمی انقلاب کے لیے تمام دنیا کے سرمایہ دار طبقہ کے خلاف تمام دنیا کے محنت کش لوگوں کو یکجا کرنے کا نعرہ بلند کیا۔ اس نے مذہب کو افیون قرار دیا جس میں عوام کو مبتلا کر کے سرمایہ دار طبقہ اسے لوٹتا ہے۔

اگر مارکس کے نظریے کو ارتقاء یافتہ نظریہ اور اس کے پیش رو فلسفیوں کے خیالات کو رجعت پسندانہ نظریہ قرار دیا جائے جیسا کہ مارکس کا دعویٰ تھا تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسانی تاریخ آگے جانے کے بجائے پیچھے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کیوں کہ اب ساری دنیا میں عملاً وہی نظریات قبول کیے جارہے ہیں جن کو مارکس نے ایک صدی پہلے رد کر دیا تھا۔ روس میں جس حد تک کمیونزم کے نظریات کو اختیار کرنے کی کوشش کی گئی وہ اگرچہ خود مکمل نہیں تھا مگر اس کے بعد جن ملکوں میں یہ نظریہ پھیلا وہاں اور بھی سمٹتا گیا۔ یہاں تک کہ بالکل پیچھے چلا گیا۔ مارکس اپنے سابق سوشلسٹ مفکرین کے برعکس سرمایہ داری نظام کے ساتھ آخری اور فیصلہ کن تصادم کو ناگزیر سمجھتا تھا۔ اس کے ارتقائی سوشلزم کے مطابق مزدور اور سرمایہ دار میں کشمکش کو تیز تر ہو جانا چاہئے تھا، مگر اب یہ نظریہ بدل گیا ہے۔ اب پھر وہی

پرانے زمانے کا سوشلزم آ گیا ہے۔اب نہایت زور وشور کے ساتھ اس بات کی تبلیغ کی جارہی ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔اس سلسلہ میں یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ اسٹالن نے اپنے سیاسی رقیبوں کوشکست دینے کے لیے ان کے خلاف غیر ملکی سامراجیوں سے ساز باز کا الزام لگایا تھا۔اور اب خروشچیف کو اپنے مخالفوں پر یہ الزام لگانا پڑا ہے کہ وہ سرمایہ دار ملکوں کے ساتھ ''پرامن بقائے باہم'' کے مخالف تھے۔تشدد کے ذریعہ انقلاب لانے کے نظریہ کو چھوڑ کر دوبارہ پرامن انقلاب کا اصول اختیار کر لیا گیا۔''سرمایہ داری کو قانونی ذرائع سے ہلاک کیا جاسکتا ہے۔'' دوسری جنگ عظیم تک اس تصور کو نہایت رجعت پسندانہ خیال کیا جاتا تھا اور اس کا مذاق اُڑایا جاتا تھا۔یہی نظریہ رکھنے کے جرم میں نجارن کو''غدار'' قرار دیا گیا اور اسی کے جرم میں ہزاروں منشویکوں کو بالشویک پارٹی سے خارج کر دیا گیا۔مگر اب سوشلزم دوبارہ لوٹ کر اسی کی طرف آ گیا ہے۔تمام دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں نے متشددانہ طریق کار کے نظریہ سے توبہ کر کے آئینی طریق کار کے رجعت پسندانہ نظریہ کو اختیار کر لیا ہے۔''طبقاتی ریاست کا نظریہ مدّت ہوئی ختم ہو چکا ہے اور زمانۂ ماضی کا عوامی حکومت کا نظریہ ساری کمیونسٹ دنیا میں تسلیم کیا جانے لگا ہے۔کمیونسٹ لیگ نے دسمبر ۱۸۴۷ میں کارل مارکس کے اصرار پر اپنا پرانا موٹو''تمام انسان بھائی ہیں'' بدل کر نیا موٹو''دنیا کے مزدورو متحد ہو جاؤ'' اختیار کیا تھا۔مگر اب پھر تاریخ کا رخ بدل گیا ہے جو الفاظ پہلے مٹا دئے گئے تھے وہی اب دوبارہ صفحہ کی زینت بن رہے ہیں۔روس میں اشتراکی نظام''مزدور طبقہ کی حکومت'' کی شکل میں ظاہر ہوا تھا اور اب چین نے اپنے لیے عوامی چین (Peoples China) کا روپ اختیار کرنا پسند کیا ہے۔ذرائع پیداوار پر مکمل ریاستی ملکیت کا نظریہ اب صرف کتابوں میں ہے۔ورنہ دنیا میں کہیں بھی اب اس کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔حتی کہ روس میں بھی اس کو اختیار نہیں کیا گیا جہاں انقلاب پر تقریباً آدھی صدی کی مدت گزر چکی ہے۔اشتراکی منشور جو ۱۹۴۸ میں شائع کیا گیا تھا اس میں قدیم سماجی نظام کو ختم کرنے کے لیے تمام ذرائع پیدائش کو ریاست کی ملکیت'' بنانا ضروری قرار دیا گیا ہے۔زمین کی ملکیت کا مکمل خاتمہ اور وراثت کے تمام حقوق کی تنسیخ کا اعلان کیا گیا ہے۔مگر دنیا کے کسی اشتراکی ملک میں ابھی تک اس کو

اختیار نہیں کیا جاسکا اور نہ بظاہر کسی ملک کا ارادہ ہے کہ وہ ایسا کرے۔ بلکہ اشتراکی ممالک دن بدن اپنے موجودہ مقام سے بھی پیچھے ہٹتے جارہے ہیں۔ جیسا کہ یوگوسلاویہ میں عملاً ہو چکا ہے۔ بین الاقوامی کمیونزم کو دوسری انٹرنیشنل نے خود اپنے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔ اس کو دوبارہ کمنٹرن (communist international) کے ذریعہ زندہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ مئی ۱۹۴۳ میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ایگزیکیٹو کمیٹی کی مجلس صدارت نے یہ سفارش کی کہ بین الاقوامی مزدور طبقہ کی تحریک کے ہدایتی مرکز کی حیثیت سے کامنٹرم کو برخاست کر دیا جائے۔ انٹرنیشنل کی تمام قومی شاخوں نے اس تجویز کی توثیق کر دی اور ۲۰ مئی ۱۹۴۳ کو دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اسے ختم کر دیا گیا۔ پھر اسی صدی کے نصف میں کامن فارم کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس کی حیثیت عالمی مزدور تحریک کے ہدایتی مرکز کی نہیں تھی بلکہ محض دفتر اطلاعات کی تھی۔ مگر اسٹالن کی وفات کے بعد اس کا بھی خاتمہ کیا جا چکا ہے اور ہر ملک میں سوشلزم نے قومی سوشلزم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مذہب کے متعلق مارکس کا نظریہ دوسری جنگ عظیم میں ناکام ہو چکا ہے۔ پہلے کمیونزم کو باقاعدہ طور پر مذہب کے مخالف کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ ۱۸۷۵ میں سوشلسٹ لیبر پارٹی نے اپنے گوتھا پروگرام میں مذہب کو "ایک ذاتی معاملہ" قرار دیا تھا۔ مارکس نے اس پروگرام پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ:

> "مزدور جماعت کو تو اس سے کچھ آگے قدم بڑھا کر انسانی ذہن وضمیر کو مذہب کے پنجۂ اقتدار سے آزاد کرنے کی سعی کرنی چاہئے۔ مگر یہ لوگ (سوشلسٹ) سرمایہ دار مہاجنوں سے آگے کوئی قدم اٹھانا پسند نہیں کرتے۔"

مگر اب خود کمیونسٹ پارٹیوں نے وہی قدیم زمانے کا نظریہ اختیار کر لیا ہے۔ وہ مسلسل اعلان کر رہے ہیں کہ وہ مذہب کے مخالف نہیں ہیں۔ وہ ہر شخص کو اس کی آزادی دیتے ہیں کہ اپنی مرضی کے مطابق، جو عقیدہ چاہے، رکھے اور جیسے چاہے عبادت کرے۔

کمیونسٹوں کا دعویٰ تھا کہ "کمیونسٹ مینی فسٹو کی اشاعت کے بعد یوٹوپین سوشلزم کا دور ختم ہو گیا

اور مارکس اور انگلس کے سائنٹیفک سوشلزم کا دور شروع ہوا ہے۔'' مگر واقعات نے اس دعوے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ اب ساری دنیا میں مارکس کے ترقی یافتہ اشتراکی نظریات کے بجائے قدیم مفکرین کے رجعت پسندانہ سوشلزم کو اختیار کیا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے مارکس کے سماجی سائنس کے نظریہ کی تردید کر دی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سماج کا کوئی ایسا لگا بندھا نظام نہیں ہے جس کے تحت وہ مسلسل ارتقاء کر رہا ہو اور ہمیشہ آگے کی طرف جاتا ہو بلکہ خارجی حالات کے تحت وہ مختلف شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے۔ پھر اس سے مارکس کے اس دعوے کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ سماج کے بارے میں رجعت پسندانہ نظریات کیا ہیں اور ترقی پسند نظریات کیا ہیں۔ مارکس کے سائنٹفک نقطۂ نظر کے مطابق، اس کے فیصلہ کی بنیاد خود سماج کی ارتقائی حالت تھی۔ یعنی سماج مستقبل میں جو شکل اختیار کرے وہ لازمی طور پر ترقی یافتہ شکل ہے اور ماضی کی جس شکل کو چھوڑ دے وہ لازمی طور پر ناقص صورت ہے۔ اس اصول کے مطابق، مارکس نے سماج کے متعلق ماضی کے تمام نظریات کو رد کر دیا تھا۔ اس کے نزدیک جو چیز کل درست تھی وہ آج درست نہیں ہو سکتی۔ مگر واقعات نے مارکسی نظریہ کی تردید کر دی ہے۔ مارکس نے مستقبل کے سماج کے لیے جس ہیئت کی پیشین گوئی کی تھی اس کو سماج نے اختیار نہیں کیا اور ماضی کی طرف رجعت کر کے ان نظریات کو اختیار کر لیا جن کو ایک سو سال پہلے مارکس غلط قرار دے چکا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ نظریات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرنے کی یہ بنیاد صحیح نہیں ہے کہ سماج اپنے سفر کے دوران میں کس کو لیتا ہے اور کسے رد کر دیتا ہے۔ اس کے فیصلہ کے لیے کوئی بنیاد ڈھونڈنی پڑے گی۔

یہ سوشلزم کی مثال تھی۔ اس کے علاوہ دوسری مثالوں سے بھی مارکسی نظریہ کی تائید نہیں ہوتی۔ مثلاً فرانسیسی جمہوریت کو لیجئے۔ بظاہر جمہوری نظام ایک ارتقائی قدم تھا جو شخصی حکومتوں کے بعد تاریخ نے اٹھایا تھا۔ مگر جون ۱۹۵۸ میں فرانس کی قومی اسمبلی نے جو فیصلہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سو سال کے نشیب و فراز کے بعد فرانس کی جمہوریت دوبارہ شخصی نظام کی طرف واپس جا رہی ہے۔ اس فیصلے کے مطابق، جنرل ڈیگال کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ پارلیمنٹ کی مدد کے بغیر تنہا فرانس

کے اوپر چھ مہینے تک حکومت کرے۔ مخالف پارٹیوں کے شور وغل کے باوجود یہ قانون سترہ گھنٹہ کے اندر منظور ہو گیا۔ اسمبلی میں ۱۹۹ کے مقابلے میں ۳۳۱ ووٹوں سے اور سینٹ میں ۲۸ کے مقابلہ میں ۲۶۹ ووٹوں سے ایک فوجی کے حق میں ڈکٹیٹر شپ کا یہ فیصلہ کیا گیا۔[1]

مارکس کے سماجی ارتقاء کے نظریہ کے مطابق، فرانس جو شخصی نظام سے جمہوریت تک آ گیا تھا، اب چاہیئے تھا کہ وہ جمہوری نظام سے پرولتاری نظام کی طرف قدم بڑھاتا مگر ترقی کے بجائے اس نے تنزل شروع کر دیا۔ مارکس نے ایک صدی پہلے کہا تھا کہ ــــــ ''سرخ جمہوریت پیرس کے اوپر جھانک رہی ہے۔'' مگر فرانس کی جمہوبیت 'سرخ جمہوریت'' بننے کے بجائے ''تاریک ڈکٹیٹر شپ'' میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ واقعات صاف طور پر ظاہر کر رہے ہیں کہ تاریخ کے سفر کا کوئی متعین ارتقائی قانون نہیں ہے بلکہ یہاں کوئی باشعور محرّک ہے جو اس کو کبھی آگے اور کبھی پیچھے کی طرف لے جاتا ہے۔

---

[1] اور چھ مہینے گزرنے کے بعد ایک نمائشی کارروائی کر کے اس غیر جمہوری تقرر کو مستقل حیثیت دے دی گئی ہے۔

توجیہہ

سماجی ارتقاء کے بارے میں مارکس کی پیشین گوئیوں پر اب ایک صدی پوری ہو چکی ہے۔ مگر جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں نہایت تفصیل سے واضح کیا ہے، مارکس کے بعد حالات نے اس دوران میں عملاً جو رخ اختیار کیا اس سے مارکسی نظریہ کی تائید نہیں ہوتی بلکہ صریح طور پر اس کی تردید ہوتی ہے۔ مگر مارکس کے متبعین اس واضح حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ مارکسی نظریہ کی توجیہہ کرتے ہیں۔

۱۹۵۷ کی ابتداء میں کلکتہ ریڈیو نے ایک سمپوزیم منعقد کیا تھا جس کا عنوان تھا ''کیا مارکسزم تقویم پارینہ ہو چکی ہے''۔ اس موضوع پر مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ گوہاٹی یونیورسٹی میں اقتصادیات کے پروفیسر ڈاکٹر ٹامس نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''............ممکن ہے کہ طبقاتی کش مکش، انقلاب اور سرمایہ داری کی تباہی کی پیشین گوئی جو مارکسی نظریہ کے تحت کی جاتی ہے، پرانی بات نظر آئے۔ لیکن کیا اس حقیقت سے بھی انکار ممکن ہے کہ آج دنیا میں سرمایہ کی بے حساب ذخیرہ اندوزی کی جا رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں امیر لوگ زیادہ امیر اور غریب لوگ زیادہ غریب ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ چیز ایک مستقل طبقاتی کش مکش اور لازمی انقلاب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ صرف اسی وجہ سے بہت سے ملکوں میں انقلاب آئے ہیں اور ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کی بنا پر ہم یقینی طور پر یہ کہہ سکیں کہ انقلابات کا دور ختم ہو چکا ہے اور آئندہ کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ اگر ملکوں کی بیشتر تعداد ایسی ہے جہاں انقلاب ابھی تک نہیں آیا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان میں سرے سے انقلاب کا کوئی امکان ہی

نہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہاں قومی پیداوار کی زیادہ فراخ دلانہ تقسیم کے ذریعہ انقلاب کو روک دیا گیا ہے۔''

''اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا یہ اقدامات خواہ یہ سرمایہ جمع کرنے والوں نے خود کیے ہوں یا ان کی طرف سے حکومت نے کیے ہوں اس بات کی ضمانت نہیں ہیں کہ انقلاب پھر رونما ہوں گے۔لیکن اگر مارکسی نظریہ کی سچائی ان انقلابات سے ثابت نہیں ہوتی جو ماضی میں ہو چکے ہیں تو انقلاب کے عارضی طور پر روک دیے جانے سے یہ نظریہ غلط بھی ثابت نہیں ہوتا۔''

اس توجیہہ کا مطلب یہ ہے کہ انقلاب کے اسباب سماج کے اندر اب بھی پرورش پا رہے ہیں ، البتہ بعض عارضی اقدامات کی وجہ سے انقلاب کو فی الحال روک دیا گیا ہے۔ یہ توجیہہ جو ابتداءً کالسٹکی (Kalitasky) نے پیش کی تھی اور اس کے بعد مختلف لوگوں کی طرف سے مختلف انداز میں دہرائی جاتی رہی ہے، یہ درحقیقت مارکسزم کی توجیہہ نہیں بلکہ اس کی تنسیخ ہے۔ سماجی تبدیلیوں کے متعلق مارکس کی پیشین گوئی کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ انسانی سماج کے اندر جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان کا اسی طرح ایک اٹل قاعدہ ہے جس طرح مادی دنیا کے اندر ہونے والے واقعات کا قاعدہ ہے۔یعنی جس طرح زمین ایک معین اصول کے مطابق گردش کر رہی ہے اور کوئی اس کو روک نہیں سکتا ۔اسی طرح سماج کے اندر ارتقائی تبدیلیاں بھی لازمی تقاضے کے طور پر آتی ہیں۔ سماجی تبدیلیوں کا ایک اٹل قانون ہے جو انسان کی مرضی سے آزاد ہو کر اپنا کام کرتا ہے۔ کسی کے بس میں نہیں ہے کہ اس کو بدل سکے، لیکن اس نظریہ کے برعکس، توجیہہ یہ کہتی ہے کہ انسان اس تبدیلی کے قانون پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کو عارضی طور پر ملتوی کر سکتا ہے۔ یہ توجیہ سماجی تبدیلیوں کے قوانین پر انسانی ارادہ کے تصرف کو محدود مدّت کے لیے تسلیم کرتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب درمیانی مدت کے لیے آپ انسانی تصرف کو تسلیم کرتے ہیں تو کس منطق سے اس کی آخری منزل کے لیے اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ انقلاب کی درمیانی منزلوں میں اگر انسان کا ارادہ حالات پر اثر انداز ہو سکتا ہے تو اس کی

آخری منزل میں کیوں اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ اگر عارضی اقتدار کا نظریہ مانا جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس دنیا میں کچھ ایسی طاقتیں بھی ہیں جو تاریخ کے سفر پر اثر انداز ہوتی ہیں، جو تاریخی قوتوں کو کبھی کبھی زیر کر لیتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کس دلیل کی بنا پر تسلیم کیا جائے کہ ان قوتوں کا اثر صرف وقتی ہوتا ہے۔ مارکس نے سماجی تبدیلی کے قوانین پر انسانی تصرف سے مطلقاً انکار کیا تھا، اب آپ درمیانی مدت کو اس سے مستثنیٰ کر رہے ہیں۔ پھر جس طرح درمیانی مدت کے لیے مارکس کا مفروضہ غلط ثابت ہو گیا، ٹھیک اسی طرح آخری منزل کے لیے بھی یہ مفروضہ کیوں غلط ثابت نہیں ہوگا۔ اس کے خلاف کیا خواہش کے سوا اور کوئی دلیل دی جا سکتی ہے۔

مارکس کے حل پر اصولی تنقید

اوپر ہم نے مارکس کے فلسفہ کا نظری حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ مارکس کا یہ فلسفہ محض فلسفہ نہیں تھا بلکہ وہ اصل زندگی کے مسائل کے ایک مخصوص حل کے لیے تائیدی نظریہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ مارکس کے نزدیک زندگی کے تمام مسائل کا حل یہ ہے کہ پیدائشِ دولت کے ذرائع پر اجتماعی ملکیت قائم کر دی جائے۔ اسی حل کو برحق ثابت کرنے کے لیے اس نے وہ فلسفہ گھڑا تھا جس کا ہم نے اوپر کی سطروں میں جائزہ لیا ہے۔

اب ہم مارکس کے تجویز کیے ہوئے حل پر گفتگو کریں گے۔ یہ گفتگو دو پہلوؤں کے اعتبار سے ہوگی۔ اولاً ہم علمی اور اصولی حیثیت سے اس حل کا جائزہ لیں گے۔ اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ تجربہ میں یہ حل کیسا ثابت ہوا ہے۔

لینن نے کہا ہے ''سوشلزم کے بغیر انسانی سماج کی نجات ناممکن ہے۔ جنگ بھوک اور دوسری سیکڑوں آفتیں جن میں بے شمار انسان تباہ ہو رہے ہیں، ان سے محض سوشلزم ہی بچا سکتا ہے۔'' مگر حقیقت یہ ہے کہ سوشلزم نے موجودہ خرابیوں کا جو حل تجویز کیا ہے، وہ خود ظلم کی ایک بدترین شکل ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی کے چہرہ سے مکھی اڑانے کے لیے آپ اس کے اوپر ایک پتھر کھینچ ماریں، جس کے نتیجہ میں مکھی تو اڑ جائے مگر آدمی کا چہرہ لہولہان ہو جائے۔

سیاسی جمہوریت کے بعد معاشی جمہوریت:

سوشلزم نے زندگی کے مسائل کا جو حل پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ معاشی پیداوار کے ذرائع کو افراد کے قبضہ سے نکال کر پوری سوسائٹی کے قبضہ میں دے دیا جائے۔ اس کا کہنا ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ دوسرے تمام مسائل اسی ایک مسئلہ کی شاخیں ہیں۔ انگلس کا مشہور قول ہے:

''انسان کو سب سے پہلے کھانے کے لیے خوراک، پینے کے لیے پانی، رہنے کے لیے مکان اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا چاہئے۔ اس کے بعد ہی وہ سیاست، مذہب، سائنس اور فنون لطیفہ میں دل چسپی لے سکتا ہے۔ اس لیے طریق پیداوار وہ اصل بنیاد ہے جس پر سماجی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہی وہ اساس ہے جس پر کہ ریاستی ادارے، قانونی تصورات، علوم وفنون حتیٰ کہ مذہبی معتقدات کی رفیع الشان عمارتیں اٹھائی جاتی ہیں''۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں اصل چیز جو اہمیت رکھتی ہے وہ یہ سوال ہے کہ حصول معاش کے ذرائع کس کے قبضہ میں ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں معاشیات کے ذرائع ہوتے ہیں وہی حکومت کرتے ہیں۔ ان ہی کی مرضی قانون کی شکل اختیار کرتی ہے، وہی مذہبی اور اخلاقی قدروں کا تعین کرتے ہیں۔ انہی کی پسند ناپسند اور انہی کے نفع ونقصان کے مطابق تمدن کے تمام شعبے ترتیب دیے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ معاشی پیداوار کے ذرائع اگر سماج کے قبضہ میں ہوں تو سماج کے تمام شعبے اور اس کے تمام ادارے سماج کے عمومی مفاد کے مطابق کام کریں گے اور اگر ان ذرائع پر چند مخصوص لوگوں کا قبضہ ہو جائے تو ساری سرگرمیوں کا رُخ بس انہی چند ہستیوں کی طرف ہو جائے گا اور عوام کے حصّہ میں کچھ نہ رہے گا۔ سوشلسٹ تجزیہ کے مطابق، آج صورت حال یہ ہے کہ دولت حاصل کرنے کے تمام ذرائع چند سرمایہ داروں کے قبضہ میں چلے گئے اور بقیہ لوگ صرف ان کے غلام بن کر رہ گئے ہیں۔ کچھ لوگوں کے حصہ میں عیش ہے اور بیشتر لوگوں کے حصہ میں افلاس اور بے روزگاری۔ کمیونسٹ مینی فسٹو میں کہا گیا ہے:

''پرولتاریہ کے نزدیک قانون، اخلاق اور مذہب سب کے سب بورژوا کے توہمات ہیں جن کے پیچھے ہزاروں بورژوا مفاد چھپے ہوئے ہیں''۔

مارکسی تشخیص کے مطابق، اس خرابی کی جڑ دراصل نجی ملکیت کا قانون ہے جس کی وجہ سے ایک شخص کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ دولت کے خزانوں کو اپنی ملکیت بنا کر دوسروں کو اس سے محروم کر دے اور

---

[1] مارکس کی قبر پر انگلس کی تقریر، بحوالہ کارل مارکس، سلکٹڈ ورکس، جلد اول، صفحہ ۱۲۔

اس طرح سماج کے اندر ایک ایسی حیثیت حاصل کر لے جہاں سب کچھ اسی کے لیے ہو اور دوسرے کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔ اس کا حل یہ ہے کہ نجی ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے اور رزق حاصل کرنے کے ذرائع کو سارے عوام کی ملکیت بنا دیا جائے۔ اس طرح رزق کے خزانوں پر چند افراد کی اجارہ داری خود بخود ختم ہو جائے گی اور زمین کی دولت اور جو کچھ اس زمین پر ہے، وہ زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو ملنے لگے گی۔

کمیونزم کے اس حل کے پیچھے جو فلسفہ کام کر رہا ہے، ٹھیک یہی فلسفہ اس سے پہلے شخصی حکومتوں کے خلاف جمہوریت کے نام سے اختیار کیا گیا تھا۔ اس وقت یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ سیاسی اختیارات زندگی میں اصل فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ جس کے ہاتھ میں ہوں وہ دوسروں کو اپنا غلام بنا لیتا ہے اور سماج کے تمام اداروں کو سماج کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی خدمت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لیے عام پبلک کو حقیقی معنوں میں آزاد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی اختیارات چند لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہوں بلکہ سارے عوام کے ہاتھ میں ہوں۔ انھوں نے کہا کہ سیاسی اختیارات سارے عوام کا حق ہیں اس لیے شاہی خاندان کے چند افراد کے بجائے سارے عوام کی حکومت ہونی چاہئے۔ لوگوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں اور ایک محدود طبقہ کو زندگی کے ہر شعبہ میں جو ترجیحات حاصل ہو گئی ہیں وہ اسی لیے ہیں کہ اختیارات پر چند افراد کا قبضہ ہے۔ اگر اختیارات تمام لوگوں کے قبضہ میں دے دیئے جائیں تو یہ ظلم خود بخود ختم ہو جائے گا۔ جان کالوین (۶۴۔۱۵۰۹) جمہوری طرز حکومت کا حامی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس قسم کی حکومت میں مخالفت اور باہمی کش مکش دونوں ختم ہو جائیں گے، کیوں کہ خود عوام ہی تو حاکم ہوں گے، پھر کون مخالفت کرے گا، کون کس پر ظلم کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اشتراکی حضرات معاشی اختیارات کو سماج کی ملکیت بنا دینا چاہتے ہیں اور وہ لوگ سیاسی اختیارات کو سماج کی ملکیت بنانے کے علم بردار تھے۔ یہ تحریک بڑے زور وشور کے ساتھ سترھویں صدی میں فرانس سے اٹھی اور بالآخر ساری دنیا پر چھا گئی۔ کیا سیاسی اختیارات کو عوامی ملکیت بنانے کا یہ اصول کامیاب ہوا۔ اس کے جواب میں مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ خود اشتراکی حضرات

یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اصول بالکل کامیاب نہیں ہوا۔ بلکہ جمہوریت خود شہنشاہی نظام کی بدلی ہوئی شکل ثابت ہوئی۔ جمہوریت کی ناکامی کی تفصیلات سے اشترا کی لٹریچر بھرا ہوا ہے۔ انگلس نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''روسو کا معاہدہ عمرانی ایک خونی حکومت (reign of terror) کی شکل میں ظاہر ہوا۔'' لینن نے کہا ہے:

''جب جاگیرداری کا تختہ الٹ گیا اور آزاد سرمایہ دارانہ سماج خدا کی زمین پر قائم ہو گیا تو یہ ظاہر ہوتے دیر نہ لگی کہ یہ آزادی محنت کشوں کے لیے جبر و استحصال کا ایک نیا نظام لائی ہے[1]۔''

جب ایسا ہے تو کیوں نہ ہم یہ سمجھیں کہ کارل مارکس کی ''معاشی جمہوریت'' کا بھی وہی انجام ہوگا جو اس سے پہلے روسو کی ''سیاسی جمہوریت'' کا ہو چکا ہے۔ جب دونوں کا فلسفہ ایک ہے اور دونوں جگہ حصولِ مقصد کے لیے یکساں طریق کار اختیار کیا گیا ہے تو آخر دونوں کا انجام کیوں مختلف ہوگا۔ جب دونوں کی منطق ایک ہے تو دونوں کا نتیجہ بھی ایک ہی ظاہر ہونا چاہئے۔

جمہوریت اور اشترا کیت دونوں بے طبقاتی سماج میں یقین رکھتے ہیں۔ دونوں کا مقصد ایک ایسا معاشرہ پیدا کرنا ہے جہاں اونچ نیچ نہ ہو۔ جہاں سب کو یکساں مواقع حاصل ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دونوں مختلف راہوں سے اس کام کو انجام دینا چاہتے ہیں۔ انسانی ساخت کے یہ دونوں نظریے اگرچہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں مگر حقیقتاً دونوں کا طرز فکر بالکل ایک ہے۔ جمہوریت نے کہا کہ سماج میں طبقات پیدا ہونے کی بنیاد یہ ہے کہ اقتدار سارے عوام کی ملکیت نہ ہو بلکہ صرف چند لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ کچھ لوگ حاکم اور بادشاہ ہوں اور بقیہ تمام لوگ ان کی رعایا ہوں۔ اس لیے اس نے نعرہ لگایا کہ ''حکومت سارے عوام کا حق ہے، اس پر سارے عوام کا قبضہ ہونا چاہئے۔'' مگر نظری اعتبار سے یہ بات خواہ کتنی ہی دلکش ہو، یہ واقعہ ہے کہ ملکی انتظام کا کام تمام لوگ نہیں کر سکتے اس لیے اقتدار کو لازماً چند لوگوں کے ہاتھ میں مرتکز کرنا ہوگا۔ چنانچہ جمہوریت نے الیکشن کا طریقہ اختیار کیا۔ جس کے معنی یہ تھے

---

[1] لینن سلیکٹڈ ورکس، جلد اول، صفحہ ۶۲، ماسکو ۱۹۴۷۔

کہ عوام اپنی مرضی سے اپنا حقِ ملکیت چند اشخاص کے ہاتھ میں دے رہے ہیں تا کہ وہ مفاد عامہ کے مطابق اس کو استعمال کریں۔ مگر خود مارکسی حضرات کے قول کے مطابق، عملاً یہ ہوا کہ چند لوگ جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوئے تھے، نسلی بادشاہوں کی جگہ جمہوری شہنشاہ بن کر عوام کے سروں پر مسلط ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح مارکسزم نے کہا کہ سماج کے اندر طبقات کی بنیاد یہ ہے کہ معاش حاصل کرنے کے ذرائع عوام کے بجائے چند لوگوں کے ہاتھ میں چلے جائیں جو مالک بن کر اس پر قبضہ کرلیں اور بقیہ لوگ ان کی ملازمت اور مزدوری کرتے رہیں۔ اس لیے اس نے نعرہ لگایا کہ ''ذرائع پیداوار عام لوگوں کا حق ہیں، ان پر سارے عوام کا قبضہ ہونا چاہیے''۔ مگر ٹھیک وہی سوال یہاں بھی پیدا ہوتا ہے جو سیاسی جمہوریت کے سلسلہ میں پیدا ہوا تھا۔ یعنی یہ کہ نظری اعتبار سے ذرائع پیداوار کو سارے عوام کی ملکیت کہہ دینے سے فی الواقع وہ سارے عوام کی ملکیت نہیں بن جاتے، بلکہ اس کے انتظام کے لیے چند لوگوں کو مقرر کرنا ہوگا جو مفاد عامّہ کے مطابق، اس کی پیدائش اور تقسیم کا بندوبست کریں۔ مارکسزم نے کہا کہ ''یہ چند لوگ'' محنت کش طبقے کے نمائندہ ہوں گے، جو سب کے مفاد کے مطابق، ذرائع پیداوار کا انتظام کریں گے۔ یہ نئے الفاظ اور نئے عنوان کے ساتھ ٹھیک وہی بات ہے جو جمہوریت نے کہی تھی۔ البتہ اس میں ''چند لوگوں'' کا دائرہ کار بہت بڑھا دیا گیا ہے۔ وہ سیاست کے ساتھ آبادی کے ایک ایک شخص کی معاش کے بھی ذمہ دار ہیں۔ جمہوریت نے اپنے ''منتخب نمائندوں'' کو صرف سیاسی خداوند بنایا تھا۔ مارکسزم نے سیاسی خداوندی کے ساتھ انھیں ان داتا کا مقام بھی دے دیا۔ مارکسی نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ تنظیم معاشیات کا کام سرمایہ کے ہاتھ سے نکل کر سیاست کے ہاتھ میں چلا جائے۔ یہ سانپ کو مار کر اژدہے کو زندہ رکھنا ہے۔ یہ نظریہ مسئلہ کو حل نہیں کرتا بلکہ اس کو اور پیچیدہ بنا دیتا ہے۔

مارکسی حضرات موجودہ بورژوا جمہوریت پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جمہوری نظام بظاہر تو اس بات کا مدعی ہے کہ وہ عوامی حکومت کا نظام ہے مگر درحقیقت وہ چند اشخاص کا نظام ہے جو عوام کے ووٹوں سے اپنی حکومت کے لیے سندِ جواز حاصل کرتے ہیں۔ مگر کیا اشتراکیت کے پاس اجتماعی ملکیت کے نظام کو چلانے کے لیے اس کے سوا کوئی اور طریق کار ہے جو جمہوریت نے اختیار کیا ہے۔

جمہوریت نے پارلیمانی طریق کار اختیار کیا ہے۔ وہ اپنے دعوے کے مطابق تو عوامی نظام ہے مگر حقیقتاً یہ عمل بالواسطہ طور پر انجام پاتا ہے، اس میں تمام افراد معاملات کو فیصل کرنے میں براہِ راست حصہ نہیں لیتے بلکہ اپنے نمائندوں کے واسطے سے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ پوری آبادی میں سے کچھ متعین لوگ ووٹر ہوتے ہیں پھر یہ ووٹر اپنی اپنی رایوں سے ایک مجلس نمائندگان کا انتخاب کرتے ہیں۔ پھر اس مجلس نمائندگان میں سے وہ چند لوگ منتخب کیے جاتے ہیں جو حکومت کو چلاتے ہیں۔ اس طرح عملاً حکومت کے سارے اختیارات چند لوگوں کے ہاتھ میں سمٹ جاتے ہیں۔ ٹھیک یہی طریقہ خود کمیونزم نے بھی اختیار کیا ہے۔ اشتراکی حکومتیں دوسرے لفظوں میں محنت کش طبقہ کی حکومتیں ہیں جو مارکس کے الفاظ میں آبادی کا ۸۰ فی صدی حصہ ہیں۔ مگر یہاں بھی وہ صورت حال نہیں ہے اور نہ درحقیقت ممکن ہے جو قدیم زمانے میں یونان کی چھوٹی چھوٹی شہری حکومتوں کی تھی جب کہ اجتماعی معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے سارے شہری جمع ہوا کرتے تھے۔ بلکہ یہاں بھی وہی نمائندگی کا بالواسطہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ پارلیمانی نظام کی ساخت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ نظری طور پر تو وہ سارے عوام کی حکومت ہے، مگر عمل میں آتے آتے وہ صرف ایک یا چند اشخاص کی حکومت بن جاتی ہے اور جب اس نظام کے ساتھ اشتراکیت بندی کے اصول کو بھی اپنا لیا جائے تو پھر تو اس کی مرکزیت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اشتراکی سماج کی نوعیت کو اگر چند الفاظ میں ادا کرنا چاہیں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ:

> ''اشتراکی حکومت میں اقتدار کلیۃً محنت کش طبقہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے یعنی کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ یعنی اسٹالن کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔''

مارکسی حضرات یہ کہتے ہیں کہ اشتراکی نظام میں وہ خرابیاں پیدا نہیں ہو سکتیں جو جمہوری نظام میں پیدا ہوئیں۔ کیوں کہ جمہوری نظام نے جو تبدیلی تجویز کی تھی وہ حقیقی تبدیلی نہیں تھی بلکہ ظالمانہ نظام نے صرف اپنا لباس بدل لیا تھا۔ زندگی میں اصل فیصلہ کن عنصر اس کی معاشیات ہوتی ہیں۔ معاشی ذرائع جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوں وہی لوگ بالآخر تمام معاملات کے مالک ہو جاتے ہیں۔ جمہوری تحریک نے معاشی ذرائع کو نجی مالکوں کے ہاتھ میں رہنے دیا۔ صرف سیاست کو عوامی ملکیت بنانے کا

نعرہ لگایا۔ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کے کوئی معنی نہیں تھے۔ کیوں کہ جب اختیارات کی اصل کنجی افراد کے قبضہ میں ہو تو حکومت بنانے کی قانونی شکل بدل دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔اس کا نتیجہ تو صرف یہی ہوگا کہ جو طبقہ اس وقت معاشی اختیارات پر قابض ہے وہی اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر سیاسی اختیارات پر بھی قبضہ کر لے گا۔ دوسرے لفظوں میں کمیونزم اس شاخ کو ہی کاٹ دینا چاہتا ہے جس پر موقع پرست لوگ اپنا آشیانہ بناتے ہیں۔ جب کسی ملک میں معاشی ذرائع و وسائل کو ''عوام کی ملکیت'' بنا دیا جائے تو وہاں سیاسی اختیارات خود بخود عوام کے قبضہ میں چلے جاتے ہیں اور عوام کو حقیقی معنوں میں آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔مگر اس تاویل کی حقیقت ایک مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

کسی سماج کے اندر خرابیاں کیوں پیدا ہوتی ہیں۔محض اس لیے کہ سماج کے بعض افراد کو سماج کے دوسرے افراد کے مقابلے میں زیادہ اختیارات اور زیادہ مواقع حاصل ہو جاتے ہیں۔ اگر سماج کا ہر فرد یکساں ہو اور کسی کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہ ہو تو ظلم اور لوٹ کھسوٹ کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں اختیارات کی مرکوزیت ہی وہ اصل سبب ہے جو سماج کے اندر ناانصافی کا سبب بنتی ہے۔اسی بنا پر مارکسی حضرات انفرادی ملکیت کے مخالف ہیں۔ کیوں کہ اس نظام میں ایک شخص کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ ذرائع معاش اپنے پاس اکٹھا کر لے۔سماج میں نابرابری پیدا کر کے اپنی بڑھی ہوئی حیثیت سے فائدہ اٹھائے اور پھر اپنے سے کمزوروں پر ظلم کرنا شروع کر دے۔کمیونسٹ مینی فسٹو میں مارکس اور انگلس نے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ذرائع پیدائش کو مرتکز کر کے دولت کو چند افراد کے قبضہ میں دینے کا لازمی نتیجہ سیاسی مرکزیت ہے۔''

اختیارات کی اسی مرکوزیت کو ختم کرنے کے لیے مارکس نے اختیارات کو سماجی ملکیت بنانے کا نعرہ لگایا۔مگر اس نے جو شکل تجویز کی ہے کیا حقیقتاً اس سے اختیارات عوام کی ملکیت بن جاتے ہیں اور سماج کو ''مرکوزیت'' کی لعنت سے نجات مل جاتی ہے۔کسی چیز کا ایک نام رکھ دینے سے اس کی حقیقت نہیں بدل جاتی۔موجودہ جمہوری نظام یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے سیاسی اختیارات کو سارے عوام کی

ملکیت بنا دیا ہے مگر اشتراکی حضرات اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتے، بلکہ عملاً جمہوری نظام کا تجزیہ کرکے دیکھتے ہیں کہ فی الواقع اختیارات کا مالک کون ہے۔ اسی طرح خود اشتراکی حضرات کے دعوے کو بھی عمل کی دنیا میں جانچ کر دیکھا جائے گا کہ وہ فی الحقیقت کیا شکل اختیار کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح سرمایہ دارانہ سماج میں پیداوار کے ذرائع کو حرکت دینے کا اختیار چند سرمایہ داروں کو حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح اشتراکی سماج میں بھی اس کے بغیر چارہ نہیں کہ ان ذرائع کو حرکت دینے کا اختیار چند کامریڈوں کو سونپ دیا جائے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ایک جگہ اختیارات کی مرکوزیت انفرادی ملکیت کے نام پر ہوتی ہے اور دوسری جگہ یہی عمل سماجی انتظام کے نام پر انجام دیا جائے گا۔ اس طرح صرف شکلوں کا فرق ہے ورنہ اصل خرابی ـــــ ارتکاز دونوں جگہ پایا جاتا ہے۔ پھر جمہوریت کے عوامی نظریہ کا جو انجام ہوا وہی آخر مارکسزم کے ''مزدور نظریہ'' کا کیوں نہ ہوگا۔ جب کہ اس میں مرکزیت کی خرابی دگنی شدت کے ساتھ جمع ہوگئی ہے۔ لینن نے روس کے موجودہ اشتراکی نظام کو ''سٹیٹ سوشلزم'' سے تعبیر کیا تھا۔ مگر سٹیٹ سوشلزم زیادہ صحیح لفظوں میں ''سٹیٹ کیپٹلزم'' ہے۔

روسی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس میں اسٹالن کے بارے میں جو اعترافات کئے گئے ہیں وہ بھی اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ معاشی وسائل کو عوامی ملکیت بنا دینے سے حقیقتاً اختیارات عوام کے ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اسٹالن نے جس وقت مفاد عام کے طریقہ پر کام کرنے سے انحراف کیا تھا اس وقت فوراً عوام اسے برطرف کر دیتے، نہ کہ انتہائی ظالم بن جانے کے بعد بھی وہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک ملک کا حاکم اعلیٰ بنا رہا اور روس کے کسی بڑے سے بڑے آدمی حتیٰ کہ کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ اس کے رویہ پر تنقید کرسکتا۔

اجرتی غلامی کا نظام:

مارکسی مفکرین موجودہ ملکیتی نظام کو ''اجرتی غلامی'' کا دور کہتے ہیں۔ جس میں انسان بظاہر آزاد رہتے ہوئے بھی اپنی گزر اوقات کے لیے مجبور ہے کہ کسی سرمایہ دار کے لیے اجرت پر کام کرے۔ ان کا

کہنا ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ سماج نے غلامی کی پچھلی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں، مگر سرمایہ کا پھندا آج بھی مزدوروں کے گلے میں پڑا ہوا ہے۔ قانون کی نظر میں سرمایہ دار اور مزدور کے حقوق یکساں ہیں، مگر تمام ذرائع پیداوار پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے اور جس طبقہ کے ہاتھ میں سماج کے ذرائع پیداوار ہوتے ہیں وہی طبقہ سماج کا حکمراں طبقہ بن جاتا ہے، اور باقی تمام لوگ اس کے دست نگر ہو جاتے ہیں۔ کسی سماج میں ذرائع پیداوار کا سرمایہ داروں کے ہاتھ میں رہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک مٹھی بھر اقلیت پورے سماج پر قابض ہے۔ اس کے معنیٰ صرف یہ نہیں ہیں کہ لوہا، کوئلہ، تیل، اناج، کپڑا، سیمنٹ، وغیرہ پر اس کی اجارہ داری ہے بلکہ اجتماعی زندگی کے سارے اختیار بھی اسی کو حاصل ہوتے ہیں۔ پریس، اخبار، ریڈیو، تعلیم گاہیں، سینما، پکچر ہال، غرض وہ تمام چیزیں بھی اس کے اختیار میں چلی جاتی ہیں جن سے سیاسی رائیں اور خیالات بنتے ہیں۔ اس طرح آدمی کے جسم سے لے کر اس کے دماغ تک پورا وجود اس کی مٹھی میں ہوتا ہے اور وہ جمہوریت کے خوب صورت عنوان سے اپنی ڈکٹیٹر شپ لوگوں کے اوپر مسلّط کر دیتا ہے۔

موجودہ جمہوری نظام کے متعلق مارکسی مفکرین بڑے زور وشور کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بات جمہوریت سے زیادہ اس نظام پر راست آتی ہے جس کو یہ حضرات جمہوریت کے بعد لانا چاہتے ہیں۔ جس طرح جمہوریت اختیارات کو مخصوص گروہ کے ہاتھ میں مرتکز کرتی ہے۔ اسی طرح سوشلزم بھی تمام اختیارات کو ایک مخصوص پارٹی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ پھر ''مزدوروں کی حکومت'' کس لیے عوام کی حکومت سے مختلف ہوگی۔ جمہوری تحریک نے یہ نعرہ لگایا تھا کہ ''شاہی طبقہ کے بجائے عوام کی حکومت'' ہونی چاہئے۔ مگر جب اس نعرہ کو عمل کی صورت دی گئی تو بقول آپ کے، عوام کے چند ''نمائندے'' سارے اختیارات اور ذرائع و وسائل پر قابض ہوگئے اور عوام کی حالت میں اس کے سوا کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کہ وہ ایک آقا کی غلامی سے نکل کر دوسرے آقا کی غلامی میں چلے گئے۔ اسی طرح اشتراکیت کا نعرہ ہے کہ ''سرمایہ دار طبقہ کے بجائے مزدوروں کی حکومت'' پھر کیوں ایسا نہیں ہوگا کہ اشتراکی انقلاب کے بعد جن ''مزدور نمائندوں'' کو ریاستی اقتدار اور معاشی اسباب و ذرائع سونپے جائیں گے وہی بالآخر ڈکٹیٹر بن جائیں گے اور جبر و استحصال کا نیا نظام قائم ہو

جائے گا۔موجودہ بورژوا طبقہ کے بارے میں مارکس اورانگلس نے لکھا ہے کہ اس نے ''مذہبی اور سیاسی فریب کے پردہ میں روپوش استحصال کو عریاں ، بے غیرت ، براہ راست اور وحشیانہ استحصال میں تبدیل کر دیا ہے[1] ''۔ یہ تنقید جس قدر ''بورژوا نظام'' پر صادق آتی ہے اس سے زیادہ خود اشتراکی نظام پر صادق آتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ سیاسی جبر اور اقتصادی لوٹ جو موجودہ نظام میں بے قاعدہ طور پر ہورہی ہے اس کو اشتراکی نظام باقاعدہ اور منظّم بنا دیتا ہے۔حکمراں گروہ جو عام حالات میں صرف پولیس اور فوج کا مالک ہوتا ہے، مارکس انہی کے ہاتھ میں سارے ملک کی معاشیات بھی دے دیتا ہے۔کیا یہ ظلم پر عذاب عظیم کا اضافہ نہیں ہے؟

جمہوری معاشیات میں آدمی کو صرف معاشی تکلیف ہوتی ہے مگر اشتراکی معاشیات میں ایک مزید نقصان یہ ہے کہ معاشی تکلیف پر تمدنی عذاب کا اضافہ ہو جاتا ہے۔سرمایہ داری نظام میں تو آدمی آزاد ہے کہ اپنی مرضی سے کوئی پیشہ اختیار کرے، مگر اشتراکی نظام میں اسی کے ساتھ آدمی کو دفتریت اور نوکر شاہی کا بھی شکار ہونا پڑتا ہے۔آزاد لین دین اور سرکاری افسروں کے ذریعہ معاش کی تنظیم میں زبردست فرق ہے۔پہلی صورت میں آدمی آزاد ہوتا ہے کہ وہ کس پیشہ کو اختیار کرے۔وہ کتنا وقت کس کام میں دے، وہ جب کوئی کام کرتا ہے یا کسی دکان سے سامان خریدتا ہے تو دوسرے سے اس کا معاملہ ایک برابر کے آدمی سا ہوتا ہے۔دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو اس کی ضرورت کی کوئی چیز دیتا ہے اور اس سے اپنی ضرورت کی کوئی چیز لیتا ہے اس طرح دونوں کے درمیان برابر کا معاملہ ہوتا ہے، مگر سرکاری تنظیم میں ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اوپر کچھ لوگ ہیں جو اس کے خداوند ہیں۔وہ جو کچھ کرسکتا ہے اپنے اوپر کے ایک صاحب اختیار کی اجازت سے کرسکتا ہے۔اس طرح معاملہ دو برابر کے آدمیوں کے درمیان ہو جاتا ہے جن میں سے ایک بے اختیار ہے اور دوسرا با اختیار، ایک اجازت مانگنے والا ہے اور دوسرا وہ جس کے دستخط سے اجازت ملے گی۔اس طرح ہر شخص یا تو کسی کا خداوند ہوتا ہے یا اس کے اوپر کوئی خداوند ہوتا ہے۔آزاد معیشت میں آدمی کی خودی باقی رہتی ہے اور ترقی کرتی ہے

---

[1] اشتراکی منشور

جب کہ سرکاری انتظام میں اس کی خودی مر جاتی ہے اور ہر شخص اپنے سے اوپر والوں کی خوشامد کرنے والا اور اپنے سے نیچے والوں کے لیے متکبر بن جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ''اجرتی غلامی'' کا لفظ اگر صحیح معنوں میں کہیں راست آتا ہے تو وہ اشتراکی معاشرہ ہے۔ جمہوری معاشرہ میں آدمی اجرت پر کام کرتا ہے مگر وہ اس کے لیے مجبور نہیں ہوتا۔ وہ اگر چاہے تو مزدوری کو چھوڑ کر تجارت یا کوئی آزاد پیشہ کر سکتا ہے، جب کہ اشتراکی نظام میں اس کے سوا رزق کی کوئی صورت ہی نہیں کہ آدمی سرکاری ملازمت کرے یا سرکاری کارخانوں میں مزدور بن جائے۔ اس کے علاوہ جمہوری معاشرہ میں آدمی پھر بھی آزاد ہوتا ہے۔ جب کہ اشتراکی معاشرہ میں مکمل سیاسی اور معاشی آمریت اس کے اوپر مسلط ہو جاتی ہے۔ ''مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ'' دراصل نام ہے تمام لوگوں کو مزدور بنا کر ان کے اوپر ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے کا۔

اجتماعی ملکیت کا نظام انفرادی لوٹ کی بدترین شکل:

ملکیتی نظام کے خلاف مارکسزم کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس میں بالآخر سارا سرمایہ سمٹ کر چند لوگوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور یہ گروہ اتنا طاقتور ہو جاتا ہے کہ تمام سیاسی اور معاشی سرگرمیوں پر اس کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے۔ حکومتوں کی پالیسی بالکل اس گروہ کے مفاد کی پابند ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ ملک کے باشندے سرمایہ داروں کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں، بلکہ سرمایہ داروں کے درمیان باہمی مفاد کی کشمکش بین الاقوامی دنیا کے امن کو بھی غارت کر دیتی ہے جس کی ایک نمایاں مثال دوسری جنگ عظیم ہے۔ ۱۹۱۴ کی لڑائی کے بعد تمام بڑے ممالک کے درمیان آپس میں معاشی جنگ چھڑ گئی۔ ہر ملک کی حکومت نے اپنے ملک کے سرمایہ داروں کے دباؤ میں پڑ کر دوسرے ملک کے خلاف فیصلے کیے۔ دوسرے ملکوں کے مال کی درآمد پر بھاری بھاری محصول لگائے۔ جس کا نتیجہ تاریخ کی سب سے زیادہ ہولناک جنگ ——— دوسری جنگ عظیم کی شکل میں برآمد ہوا۔ ایک کمیونسٹ ادیب کے الفاظ میں ''سرمایہ داروں کے مفاد کے باہمی ٹکراؤ کا نام دوسری جنگ عظیم ہے۔''

موجودہ سرمایہ داری نظام کے خلاف مارکسزم کا یہ مقدمہ بالکل صحیح ہے، مگر خود اس نے اس

مشکل کا جو حل پیش کیا ہے وہ اسی برائی کی ایک بدترین شکل ہے جس کو مٹانے کا وہ دعویدار ہے۔

آپ اجارہ داری کو ختم کرنے کے لیے عام پبلک کو ملکیت کے حق سے محروم کر رہے ہیں مگر کھیتی، کاروبار اور نشر و اشاعت کے مختلف اداروں کو چلانے اور ضروریات زندگی کا سامان فراہم کرنے کے لیے بہر حال آپ کو کوئی انتظام کرنا ہوگا۔ یہ انتظام یقیناً ملک کے تمام باشندے نہیں کر سکتے، بلکہ کچھ مخصوص لوگوں کو اس کا انتظام سپرد کرنا ہوگا۔ یہ منتظمین قدرتی طور پر وہی لوگ ہوں گے جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہوگی۔ جو لوگ سیاسی اختیارات کے مالک ہیں، انہی کو آپ معاش اور روزگاری کی ٹھیکیداری بھی سونپ دیں گے۔ گویا دو مختلف اختیارات جو پہلے تاجروں اور سیاسی لیڈروں میں بٹے ہوئے تھے، ان کو آپ اکٹھا کر کے صرف سیاسی لیڈروں کے حوالہ کر دینا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ نئے منتظمین جب آہستہ آہستہ تمام اختیارات پر قابض ہو جائیں گے اور روٹی کی تقسیم سے لے کر خیالات کی اشاعت تک ہر چیز ان کے قبضہ میں چلی جائے گی تو کیا اس طرح پہلی اجارہ داری سے بڑی اور خطرناک اجارہ داری نہیں پیدا ہوگی جس کے مٹانے کے لیے آپ نے تمام آبادی کو ملکیت اور آزاد ذریعہ معاش سے محروم کر کے محض سرکاری ملازمین میں تبدیل کر دیا تھا۔ اجارہ داری کا مطلب اگر یہی ہے کہ کچھ لوگوں کے ہاتھ میں بیشتر لوگوں کا رزق آ جائے تو کیا یہ اجارہ داری نہیں ہے کہ چند سیاسی لیڈر پورے ملک میں روٹی اور کپڑے کے ٹھیکہ دار بن جائیں۔ نہ کسی کو کھیتی کرنے کی اجازت ہو نہ کاروبار کرنے کی۔ سارے ملک کا بس ایک ان داتا ہو اور سب کا رزق اسی کے دربار سے تقسیم ہوتا ہو۔ یہ اجارہ داری جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی وہ اگر بگڑ جائیں تو پورے ملک کو جیل خانہ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ان اجارہ داروں کے ہاتھ میں محض کوئی ایک صنعت یا کارخانہ نہیں ہوگا بلکہ سارے ملک کے تمام ذرائع معاش ان کے قبضہ میں ہوں گے۔ پریس اور تعلیم گاہیں بھی انہی کے قبضہ میں ہوں گی۔ ہر قسم کی پنشنوں اور ملازمتوں کے تقرر کا حق انہی کو حاصل ہوگا۔ ان کو اختیار ہوگا کہ جس کو جو کچھ چاہیں دیں اور جس سے جو چاہیں چھین لیں۔ وہ اگر کسی سے خفا ہو جائیں تو سارے ملک میں اس کو کہیں روزگار نہیں مل سکتا۔ کیوں کہ روزگار کی تمام شکلوں کے وہ تنہا اجارہ دار ہیں۔ وہ جس کو روٹی نہ دینا چاہیں، وہ کہیں سے

اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ کیوں کہ رزق کے تمام خزانوں کی کنجیاں انہی کے پاس ہیں۔ وہ خواہ کتنا ہی ظلم کر ڈالے مگر کسی پریس میں اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جا سکتی، کیوں کہ پریس بھی سب کے سب انہی اجارہ داروں کی مٹھی میں ہیں۔ اس طرح کی اصلاح کا مطلب صرف یہ ہے کہ برلا اور ٹاٹا کو ختم کر کے چند وزیروں اور گورنروں کو ان کی جگہ پر بٹھا دیا جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ برلا اور ٹاٹا کو زندہ رکھیں۔ مگر یہ کون سی عقل مندی ہے کہ چھوٹے اور بے اختیار سرمایہ داروں کو ختم کر کے ایک سب سے بڑا سرمایہ دار اپنے سروں پر مسلط کر لیں اور وہ بھی ایک ایسا سرمایہ دار جس کو لامحدود اختیارات حاصل ہوں۔ جس کے خلاف ہڑتال کرنا اور جس کو بدلنے کی کوشش کرنا آپ کے بس میں نہ رہے۔ آج اگر سیٹھ رام کرشن ڈالمیا کوئی زیادتی کرے تو پولیس اس کو گرفتار کر لیتی ہے۔ لیکن وزیر اور گورنر صاحبان اگر زیادتی کرنے لگیں تو ان کو کون گرفتار کر سکتا ہے۔ ان کے خلاف وارنٹ جاری کرنے والا خود ان کا ملازم ہے پھر کس کو جرأت ہے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی ملکیت کا نظام انفرادی لوٹ کی بدترین شکل ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ لوٹنے والے جو اب تک محض اپنی دولت کے زور سے لوٹ رہے تھے ان کو اس بات کا موقع دے دیا جائے کہ وہ اپنی کارروائیوں کے لیے قانون کی حمایت حاصل کر لیں اور فوج اور پولیس کی مدد سے زیادہ منظّم طریقہ پر لوٹ کا کام کر سکیں۔

اشتراکی حل کا دوسرا فائدہ جو بتایا جاتا ہے وہ بین الاقوامی دنیا کا امن ہے۔ برٹرینڈ رسل نے کہا ہے: ''سوشلسٹ انقلاب عالم گیر امن کی طرف جانے والی سڑک ہے۔'' مگر اس حل کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ چند بستیاں جو الگ الگ کئی ڈاکوؤں کا شکار ہو رہی ہوں ان سب کو ملا کر صرف ایک بڑے ڈاکو کی شکارگاہ بنا دیا جائے۔ امن عالم قائم کرنے کی تدبیر کا مطلب صرف یہ ہے کہ چند کامریڈوں کے ہاتھ میں ساری دنیا کے انسانوں کی قسمت دے دی جائے۔ جس طرح اس وقت چند کامریڈ بعض ملکوں میں اس کے باشندوں کی قسمت کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ اگر سوشلزم انہی معنوں میں امن کی طرف جانے والی سڑک ہے تو ہٹلرزم اور بوناپارٹزم بھی امن کی طرف جانے والی سڑک تھی، کیوں کہ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ دنیا کی تمام قوموں پر ایک شخص یا ایک پارٹی کا اقتدار مسلط

کر دیا جائے۔ اگر اشتراکی سماج سے کش مکش ختم ہو جاتی ہے تو روس اور یوگوسلاویہ کے درمیان کیوں کشمکش ہوئی۔ مشرقی جرمنی کے مزدوروں نے ماسکو کے خلاف کیوں بغاوت کی، جس کے نتیجہ میں انھیں ٹینکوں کے نیچے پیس دیا گیا۔ پولینڈ اور ہنگری کے عوام کیوں ''روسی برادری'' میں شامل ہونے سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ''اشتراکی برادری'' کا طلسم آہنی غلامی کے سوا اور کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ جہاں یہ آہنی گرفت ڈھیلی ہوئی قومیں اس سے بھاگنے کے لیے بے قرار ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۵۷ کے درمیان کمیونسٹ چین کے صدر ماؤزے تنگ نے ایک تقریر میں کہا کہ ''کمیونسٹ سوسائٹی میں بھی اختلافات ہو سکتے ہیں''۔ یہ عالمی کمیونزم کی ناکامی کو سرکاری طور پر تسلیم کرنا ہے۔ ماوزے تنگ نے کمیونزم میں اختلاف کا امکان ظاہر کر کے ایک طرف خود اپنے ملک کی، روس سے جدا گانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔ دوسری طرف دبی زبان سے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے کہ کمیونزم کا سانپ نیشنلزم کے مینڈک کو ہضم نہیں کر سکا ہے۔ اس نے جتنے مینڈک کھائے تھے وہ سب اس کے پیٹ میں پھدک رہے ہیں اور موقع پاتے ہی نکل بھاگنا چاہتے ہیں۔ اب کمیونسٹ دنیا کو جوڑے رکھنے کی یہی ایک صورت ہے کہ ان کے باہمی اختلاف کو تسلیم کیا جائے۔ یعنی کمیونزم کی عالمی برادری بنانے کے نظریہ کو قربان کر کے ان کے نیشنلزم کے لیے جگہ بنائی جائے۔

اجارہ داری کیوں؟:

اجتماعی ملکیت کا نظام اجارہ داروں کے بغیر قائم نہیں کیا جا سکتا اور یہ اس کی ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس نظام کے اندر خود کوئی ایسی کشش نہیں ہے جس کی وجہ سے لوگ اس کی طرف مائل ہوں۔ بلکہ اس کی کامیابی کا انحصار تمام تر اس امر پر ہے کہ لوگ اس کی طرف مائل ہونے کے لیے مجبور کر دیئے گئے ہوں۔ آزاد معیشت میں کسی چیز کے بنانے کے بہت سے کارخانے ہوتے ہیں۔ وہاں کسی کارخانہ کے چلنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی حسن کارکردگی سے عوام کی نگاہ میں اپنے آپ کو مقبول بنا سکے۔ آزاد معیشت میں کسی کارخانے کی کامیابی کے معنیٰ یہ

ہیں کہ اس نے دوسرے ہم عصروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو فائق تر ثابت کر دیا ہے۔ مگر اجتماعی ملکیت کا نظام آزاد مقابلہ سے ڈرتا ہے۔ وہ جب کاروبار کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو اس میں عام پبلک کے لیے حصہ لینا حرام قرار دے دیتا ہے اور اس طرح لوگوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنی ضروریات کے لیے وہ صرف اسی کے یہاں آئیں، دوسری جگہ کہیں نہ جائیں۔ اگر ایک عام تاجر کوئی کاروبار شروع کرے تو اس کے معنیٰ صرف یہ ہوتے ہیں کہ اس کاروبار کے بہت سے تاجروں میں ایک تاجر کا اضافہ ہو گیا ہے۔ مگر حکومت ایک ایسا تاجر ہے جو دوسرے تمام تاجروں کی دکانوں کو مقفل کر کے اپنی دکان کھولتا ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ سرکاری کاروبار نجی کاروبار کے مقابلہ میں عوام کے لیے زیادہ بہتر اور مفید ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے کہ وہ فوج اور پولیس کے جلو میں آئے۔ اس کو بے خوف ہو کر کھلے مقابلہ میں آنا چاہئے۔ پھر جو طریقہ انسانوں کے لئے زیادہ اچھا ہوگا، لوگ خود ہی اس کی طرف ٹوٹ پڑیں گے اور اس کا مخالف اس کے مقابلہ میں اپنے آپ فنا ہو جائے گا۔

معاشی دنیا میں اس اجارہ داری کے معنی وہی ہیں جو سیاسی دنیا میں ڈکٹیٹر شپ کے ہوتے ہیں۔ ہٹلر نے جرمنی میں برسر اقتدار آنے کے بعد تمام سیاسی پارٹیوں کو ختم کر دیا تاکہ جب الیکشن ہو تو کوئی پارٹی اس کے مقابلہ میں نہ آسکے۔ سارے ملک میں صرف ایک نازی پارٹی ہو جس کے نمائندے الیکشن کے موقع پر نامزد کر دیے جائیں اور لوگ مجبور ہوں کہ اپنے ووٹ اسی ایک پارٹی کے بیلٹ باکس میں ڈالیں۔ آج کوئی بھی ہٹلر کی اس اجارہ دارانہ سیاست کو پسند نہیں کرتا، مگر معاشیات میں سوشلسٹ اجارہ داری کو ترقی پسند اور جاندار نقطۂ نظر کہا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ ایک جگہ ملک کو سیاسی قید خانہ بنا دیا جاتا ہے اور دوسری جگہ معاشی قید خانہ۔ دنیا پہلے نظریے کو برا سمجھتی ہے کیوں کہ اس کی غلطی سب پر واضح ہو چکی ہے۔ مگر دوسرے نظریے کا خیر مقدم کرتی ہے کیوں کہ اس کی برائیوں پر ابھی دیوار چین کا پردہ پڑا ہوا ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اجتماعی ملکیت کے نظام میں اجارہ داری بالقصد لائی نہیں جاتی بلکہ یہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب حکومت ضروریاتِ زندگی کو پیدا کرنے والے تمام ذرائع کو اپنے ہاتھ میں لے

لے تو دوسرے افراد کے لیے یہ موقع کہاں رہتا ہے کہ وہ الگ سے کوئی کام کر سکیں۔ گویا حکومت مقابلہ کرنے سے لوگوں کو روکتی نہیں بلکہ ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں کہ لوگوں کو خود ہی رک جانا پڑتا ہے۔ یہ اگر کوئی توجیہہ ہے تو ایسی توجیہہ ہر ظلم کے خلاف کی جاسکتی ہے۔ بدترین ڈکٹیٹر شپ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اس نے لوگوں کو خیالات کی آزادی سے روکا نہیں تھا بلکہ ان ذرائع پر قبضہ کر لیا تھا جہاں سے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس طرح سیاسی پابندی بالقصد ایک ایک شہری پر عائد نہیں کی گئی بلکہ وہ حکومت کے ایک عمل کا لازمی نتیجہ تھی۔ مگر اس سے قطع نظر موجودہ سوشلسٹ ممالک میں سے کہیں بھی اجتماعی ملکیت کا نظام اس آخری شکل میں نافذ نہیں کیا گیا ہے جہاں افراد کے لیے خود کچھ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ابھی تک یہ ممانعت بالقصد نوعیت ہی رکھتی ہے۔ سوشلسٹ ملکوں میں روس وہ ملک ہے جہاں اس نظام کو سب سے زیادہ اپنایا گیا ہے۔ مگر وہاں ابھی تک رہائشی مکان اور پس انداز کی ہوئی رقم اور گھر کے ضروری سامانوں پر انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کیا گیا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی اگر چاہے تو اپنے گھر میں ایک مشین تیار کر کے سامان بنانا شروع کر دے۔ روسی دستور کی دفعہ ۷ کی رو سے اجتماعی فارموں سے منسلک ہر گھرانے کو یہ حق دیا گیا ہے کہ ''اس آمدنی کے علاوہ جو اسے اجتماعی فارم کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے ملتی ہے'' اپنے گھر کے پاس ''تھوڑی سی زمین نجی استعمال کے لیے'' اور ''کھیتی باڑی کے چھوٹے چھوٹے اوزار'' رکھے۔ اسی طرح دستور کی دفعہ ۹ کی رو سے کسانوں اور دستکاروں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ ''وہ الگ الگ اپنا کام چھوٹے چھوٹے پیمانہ پر'' کر سکتے ہیں۔ البتہ ان کاموں میں صرف انفرادی محنت کا استعمال ہونا چاہئے۔ انھیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ روس میں از روئے دستور اس بات کی ممانعت ہے کہ صنعتی کاریگر اپنے فاضل اوقات میں باہم مل کر کوئی کام کر سکیں یا کوئی شخص دوسروں کو اپنے یہاں مزدور رکھ کر تجارتی پیمانے پر کاروبار کرے، اس کا حق صرف حکومت کو حاصل ہے، کسی فرد کو نہیں۔

فریب پر حماقت کا اضافہ:

برٹرینڈ رسل نے کہا ہے کہ ''تاریخی ارتقاء کے متعلق مارکس کے خیالات ممکن ہے غلط ہوں۔

پھر بھی جو سیاسی اور اقتصادی نظام اس نے پیدا کرنے کی کوشش کی، وہ ممکن ہے اسی قدر پسندیدہ ہو جس قدر اس کے پیرو اسے سمجھتے ہیں۔'' یہ موجودہ زمانہ کے سوشلسٹ مفکرین کا عام رجحان ہے، وہ مارکس کے نظریات پر یقین نہیں رکھتے۔ کیوں کہ اس کی سائنٹیفک بنیادیں بہت کمزور ہیں۔ مگر ان نظریات کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس نے سماجی فلاح کا جو اصول پیش کیا تھا اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ کیوں کہ موجودہ پریشان کن حالات میں اس کے سوا انھیں زندگی کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ موجودہ سماج میں افراد کی بڑھتی ہوئی خودغرضی اور انانیت اور باہم ایک دوسرے کی لوٹ کھسوٹ نے ان کو افراد کی طرف سے مایوس کر دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو وعظ و تبلیغ کے ذریعہ انصاف پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ معاش کے مواقع کو عوام کے ہاتھ میں دینے کے معنیٰ یہ ہیں کہ موجودہ لوٹ کھسوٹ کو مستقل طور پر جاری رکھا جائے۔ اس لیے ان کا خیال یہ ہو گیا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کی تیاری اور تقسیم کا کام افراد سے چھین کر حکومت کے سپرد کر دیا جائے جو سب کے درمیان منصفانہ طور پر اس کو تقسیم کرے۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ حکومت بھی تو عوام ہی میں سے چند افراد کا نام ہے۔ یہ لوگ مریخ سے درآمد نہیں کیے گئے ہیں بلکہ اسی زمین کے باشندے ہیں۔ وہ ذریعہ جس سے حکومت کے افراد منتخب ہو کر اقتدار کی کرسیوں تک پہنچتے ہیں وہ الیکشن ہے۔ اور الیکشن کا کام افراد بنانا نہیں ہے بلکہ اس کا کام صرف یہ ہے کہ معاشرہ جس حالت میں ہو، اس کے مطابق، اس کے مکمل نمائندہ افراد کو نکال کر رکھ دے۔ کسی معاشرے کے نمائندے اس کی اخلاقی حالت کے بھی نمائندہ ہوتے ہیں، نہ کہ منتخب ہونے کے بعد اس سے مختلف کوئی چیز بن جاتے ہیں۔ پھر سماج کے جن افراد سے آپ کو اس وقت خطرہ محسوس ہوتا ہے جب وہ بے اختیار ہوتے ہیں۔ انھیں افراد سے اس وقت خطرہ کیوں نہیں محسوس ہوتا جب وہ الیکشن میں منتخب ہو کر سیاسی اختیارات بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ کیا اس تبدیلی کے معنیٰ اس کے سوا کچھ اور ہیں کہ سماج کو غیر قانونی طور پر ڈاکہ زنی کا اختیار حاصل ہے۔

عام افراد کے مقابلے میں حکومتوں سے آپ کس بنیاد پر خیر کی توقع رکھتے ہیں۔ کیا حکومت کا کردار عوام کے کردار سے مختلف ہوتا ہے؟ کسی ملک میں جو حیثیت عام افراد کی ہوتی ہے وہی حیثیت بین

الاقوامی دنیا میں مختلف حکومتوں کی ہے۔ پھر کیا یہ حکومتیں عالمی بساط پر اس سے مختلف کسی کردار کا مظاہرہ کر رہی ہیں جو متفرق افراد اپنے ملکی دائرہ کے اندر کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں مملکتی نظام کی تبدیلی کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ سرمایہ داروں کو ختم کر کے ان کی جگہ پر عہدے دار کھڑے کر دیئے جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ مارکس کے فلسفہ کو مانے بغیر محض ''اجتماعی ملکیت'' کے اصول کی حد تک ایک معاشی حل کے طور پر اس کو اپنانا چاہتے ہیں وہ مارکس کے فریب پر حماقت کا اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ مارکس کے دعوے کو اس کے دلائل کے بغیر تسلیم کرنا ہے۔ ان لوگوں کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی کو مجرم قرار دے اور جب اس کو شبہہ نظر آئے کہ عدالت میں وہ اس کو مجرم ثابت نہ کر سکے گا تو قانون کا انکار کر کے خود ہی اسے قتل کر ڈالے۔ مارکس کا سیاسی اور اقتصادی نظام، ایک غیر معمولی اور انتہائی عمل ہے جس کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اس نے اپنے فلسفۂ تاریخ سے کام لیا تھا۔ اب مارکس کے لیے تو یہ ایک وجہ جواز ہے کہ اس نے غلط طور پر سہی، بہر حال کچھ ایسے نظریات قائم کیے جو اس کو تاریخ کے خلاف ایک نئے اقدام کے لئے حق بجانب ثابت کر سکتے ہوں۔ مگر جو لوگ اس کے مقدمات کو نظر انداز کر کے صرف اس کے نتائج کو لینا چاہتے ہیں وہ آخر کس دلیل کی بنا پر ایسا کر رہے ہیں۔ مارکس کے فلسفہ کو چھوڑ دینے کے بعد اس کے معاشی پروگرام کو اختیار کرنے کا آپ کو کیا حق ہے؟ آپ مارکس کے اس نظریہ کو نہیں مانتے کہ ''قانون، اخلاق اور مذہب سب کے سب بورژوا کے فریب ہیں جن کے ذریعہ وہ مفادات کا تحفظ کرتا ہے''۔ مگر اسی نظریہ کی مدد سے تو اس نے ذاتی ملکیت کی تنسیخ کے خلاف تمام اعتراضات کا جواب دیا تھا۔ پھر اس کو رد کرنے کے بعد آپ کو کیا حق رہتا ہے کہ لوگوں کو ان کی ملکیت سے محروم کریں جس کے وہ تمام قانونی، اخلاقی اور مذہبی تصورات کے مطابق جائز مالک ہیں۔ اس موقع پر یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ''ہم لوگوں کی ملکیتوں کو معاوضہ دے کر حاصل کریں گے''۔ سوال یہ ہے کہ ملکیت سے دست برداری آدمی کی خود اپنی مرضی سے ہوگی یا قانون اس کو طے کرے گا اور جو معاوضہ دیا جائے گا اس کو حکومت مقرر کرے گی یا وہ شخص جس کو معاوضہ لینا ہے۔ اگر انتقال ملکیت اور معاوضہ دونوں چیزیں حکومت طے کرے گی اور اصل مالکوں کی مرضی کا اس میں کوئی

دخل نہ ہوگا تو یہ کھلا ہوا جبر ہے جس کے لیے مارکسی نظریہ کو ترک کرنے کے بعد آپ کے پاس کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔ آپ مارکس کے ''قدر زائد'' کے نظریہ کو نہیں مانتے کیوں کہ اقتصادیات کی رو سے اس کا غلط ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ مگر یہی وہ نظریہ ہے جس سے مارکس سرمایہ داروں کے خلاف اپنے انتہائی اقدام کو حق بجانب ثابت کرتا ہے۔ پھر اس کو رد کرنے کے بعد آپ کو کیا حق ہے کہ کچھ لوگوں کو ''سرمایہ دار'' قرار دے کر ان کی کمائی غصب کر لیں جب کہ اس فعل کے حق میں معاشی استدلال کو آپ خود ہی غلط قرار دے چکے ہیں۔ آپ مارکس کے اس نظریہ کو نہیں مانتے کہ قدیم سماج کے بطن سے جدید سماج طاقت ہی کی مدد سے حاصل ہوتا ہے''۔ آپ کا ارشاد ہے کہ ہم تشدد کے بغیر پرامن ذرائع سے کام لے کر سماج کے اندر معاشی انقلاب لائیں گے، مگر پرامن انقلاب کا اب تک کا تجربہ ہے کہ اس میں مراعات یافتہ طبقہ نئے عنوان سے عوام پر غالب آجاتا ہے۔ پھر آپ کا پرامن انقلاب آخر کس بنا پر اس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ ہم کیوں نہ سمجھیں کہ آپ کا پرامن ذرائع سے سوشلزم لانے کا نعرہ محض ایک فریب ہے جس کے ذریعہ آپ اپنے اختیارات کو وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ آپ مارکس کے اس نظریہ کو نہیں مانتے کہ معاشی حالات میں تبدیلی کے بعد ریاست خود بخود دفنا ہو جائے گی۔ مگر یہی تو وہ نظریہ ہے جس سے مارکس اس اندیشے کا جواب دیتا ہے کہ سوشلسٹ نظام میں ریاست کے ہاتھ میں عظیم اختیارات آجانے کے بعد ظلم بڑھے گا نہیں بلکہ کم ہوتے ہوتے بالآخر ختم ہو جائے گا۔ پھر اس نظریہ کو رد کر دینے کے بعد آپ کو کیا حق ہے کہ ریاست کے ہاتھ میں وہ عظیم اختیارات دے دیں جو کسی شہنشاہ کو بھی کسی زمانے میں حاصل نہیں ہوئے تھے۔ جب کہ آپ کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ اختیارات لازماً صحیح مقاصد کے لیے استعمال ہوں گے اور کبھی غلط سمت کا رخ نہیں کریں گے۔ آپ مارکس کے اس نظریے کو نہیں مانتے کہ انسان کے خیالات اور اس کے اخلاق و عادات اس کی معاشی زندگی کا عکس ہیں۔ حالانکہ یہی وہ نظریہ ہے جس کے ذریعہ مارکس یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کی تمام اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی خرابیاں صرف طریق پیداوار کی تبدیلی سے درست ہو جائیں گی۔ پھر اس کو رد کرنے کے بعد آپ کے پاس وہ کون سی دلیل ہے جس سے آپ یہ ثابت کر سکیں کہ ملکیتی نظام کو ختم

کرنے کے بعد لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔اس نظریہ کو ترک کرنے کے بعد ملکیتی نظام کی تبدیلی کو لوٹنے والے طبقہ کی تبدیلی تو کہا جاسکتا ہے مگر اس کو سماجی اصلاح کا نام نہیں دیا جاسکتا۔آپ مارکس کے طبقاتی نظریہ کو نہیں مانتے۔آپ کا خیال ہے کہ ذرائع و وسائل کسی طبقہ کے بجائے عوام کے اختیارات میں ہونے چاہئیں۔حالاں کہ یہی طبقاتی نظریہ ہے جس سے مارکس یہ ثابت کرتا ہے کہ سماج کے بیشتر افراد کو کس طرح انصاف اور خوش حالی سے ہمکنار کیا جاسکتا ہے۔جمہوریت کی پچھلے سو برس کی تاریخ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ''عوامی حکومت'' کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں۔یہ محض ایک پرفریب لفظی ترکیب ہے جس کے ذریعہ مراعات یافتہ طبقہ محروم طبقہ کو لوٹتا ہے، کیوں کہ سماج میں جب طاقت ور اور کمزور دو قسم کے طبقے موجود ہوں۔ایسی حالت میں عوامی نظام بنانے کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے کہ کمزوروں پر طاقت ور طبقہ مسلّط ہو جائے۔اس لئے مارکس نے کہا کہ ''عوام کا فائدہ'' نہیں بلکہ ''محنت کش طبقہ کا فائدہ'' اس طبقہ کا فائدہ جو درحقیقت فائدہ سے محروم ہے۔مگر طبقاتی نظریہ کو ترک کرنے کے بعد آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ آپ کا ''عوامی نظریہ'' حقیقتاً عوام کو فائدہ پہنچانے کا سبب بنے گا اور اس کا وہی انجام نہیں ہوگا جو اب تک اس نظریہ کا ہوتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ مارکس کے فلسفہ کو اس کے پورے نظام سے الگ کرکے محض اس کے معاشی حل کو اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ اتنے بھی ذہین نہیں ہیں جتنا کہ مارکس تھا۔مارکسزم کی نظریاتی بنیادوں کو ترک کرنے کے بعد اس کا حل بالکل لغو اور بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔مارکس کے معاشی حل کا مقصد سماج کو لوٹ کھسوٹ اور استحصال سے پاک کرنا ہے۔سوال یہ ہے کہ سماج کے اندر کسی گروہ کو یہ موقع کیسے ملتا ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں پر ظلم کرے اور انھیں اپنی لوٹ کھسوٹ کا شکار بنائے۔اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں اس کو زیادہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔دوسروں کے پاس جو چیز کم ہوتی ہے وہ چیز اس کے پاس زیادہ ہوتی ہے۔دوسرے لفظوں میں اختیارات کا سمٹاؤ یا مرکوزیت ہی وہ چیز ہے جو عوام کے مقابلے میں خواص کو ظالم اور لٹیرا بناتی ہے۔کیا اشتراکی نظام میں ''مرکوزیت'' سے نجات مل جاتی ہے۔اشتراکی اصولوں کے مطابق جو سماج بنتا ہے کیا

اس میں تقسیم اختیارات کا یہ فرق مٹ جاتا ہے۔ کیا وہاں سماج کے تمام افراد نہتے کر دیئے جاتے ہیں اور کسی کے لیے یہ موقع باقی نہیں رہتا کہ وہ اگر چاہے تو دوسرے کا استحصال کر سکے۔ صورت واقعہ نہ صرف اس کے خلاف ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی ملکیت کے نظام میں اختیارات کی مرکوزیت کا عمل اپنے کمال کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ سماج کے بااختیار ادارہ کو عام حالات میں جتنے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اجتماعی ملکیت کے نظام میں اس سے کہیں زیادہ اختیارات اسے حاصل ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں سوشلسٹ نظام کے ''متولی'' اگر بگڑ جائیں تو سوشلسٹ سماج کا حال اس سے بھی ابتر ہو جائے گا جو جمہوری نظام کے متولیوں کے بگڑ جانے سے جمہوری سماج کا ہوتا ہے۔ اس اندیشے کو خود سوشلسٹ حضرات بھی محسوس کرتے ہیں۔ اشوک مہتا نے کہا ہے:

> ''سوشلسٹ اقتصادیات کا رجحان مرکوزیت کی طرف رہتا ہے۔ اس لیے اس کی سیاست کا جمہوری اور غیر مرکوز ہونا اور سنسکرتی کا آزاد پرست ہونا بہت ضروری ہے''۔[1]

مگر کسی کے ہاتھ میں اختیارات سونپ دینے کے بعد یہ امید رکھنا کہ وہ اس کو ہمیشہ صحیح مقصد کے لیے استعمال کرے گا محض خوش خیالی ہے۔ اگر جمہوری نظام میں ایسا ممکن نہیں ہے تو اشتراکی نظام میں کس طرح ایسا ہو سکتا ہے جب کہ وہاں اختیارات کی مرکوزیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

مارکس نے اس پیچیدگی کو اس طرح حل کیا کہ اس نے دعویٰ کیا کہ معاشی حالات کے بدلنے سے انسان بھی بدل جاتے ہیں۔ شعور کا بننا یا بگڑنا اور انسان کا اچھا یا برا ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کس قسم کے معاشی ماحول میں سانس لے رہا ہے۔ یہ نظریہ اگر چہ مندرجہ بالا سوال کا ایک قطعی جواب دیتا ہے مگر یہ اتنا لغو نظریہ ہے کہ اس کو اپنی صحیح شکل میں کوئی ایسا آدمی ہی قبول کر سکتا ہے جو جذبات میں اندھا ہو چکا ہو۔ چنانچہ سوشلسٹ مفکرین یا تو اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا اس کی توجیہ کرتے ہیں۔ مگر یہ توجیہ ایسی ہے کہ چاہے بطور ایک نظریہ کے اس میں صداقت ہو مگر اس سوال کے جواب کی حیثیت سے اس کی معنویت ختم ہو جاتی ہے جس کے لیے مارکس نے اس کو وضع کیا تھا۔

---

[1] جمہوری سوشلزم، صفحہ ۲۲۲۔

مارکسی حل کا تجربہ

مارکس نے زندگی کے مسئلہ کوحل کرنے کے لیے جو معاشی تجویز پیش کی ہے اوپر ہم نے اس پر اصولی حیثیت سے گفتگو کی ہے اور عقلی بحث کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ کوئی حل نہیں بلکہ محض ایک لغو کارروائی ہے جس سے ہرگز کسی بہتر نتیجہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اب ہم یہ بتائیں گے کہ اس حل کا جب تجربہ کیا گیا تو عملاً اس سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔

اشتراکیت کا اقبالِ جرم:

پچھلے صفحات میں ہم نے اشتراکیت پر زیادہ تر نظری حیثیت سے گفتگو کی ہے جس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اشتراکیت ایک نظریہ کی حیثیت سے ناکام ہوچکی ہے۔ اس نظریہ کی انتہائی خرابیاں اپنے پہلے ہی تجربہ میں پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوچکی ہیں جو اس کے اولین لیڈروں اور مفکروں کے ذریعہ روس میں ہوا تھا۔ روس اس نظریہ کی اولین تجربہ گاہ نہیں بلکہ درحقیقت وہ اشتراکیت کا مزار ہے جہاں وہ ہمیشہ کے لیے دفن ہوچکی ہے۔ اب اگر وہ زمین کے بعض حصوں میں باقی ہے تو ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے باقی ہے جیسے کہ جمہوریت باقی ہے۔ جمہوری تحریک جب ابتداءً اٹھارویں صدی عیسوی میں فرانس سے اٹھی تو وہ ایک نظریہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ زندگی کا صحیح ترین نظریہ ہے اور اسی کے ذریعہ انسانیت کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ مگر اب کہیں بھی جمہوریت اس حیثیت سے زندہ نہیں ہے۔ اب وہ صرف ایک سیاسی ہتھیار ہے جس کے ذریعہ کچھ چالاک قسم کے لیڈر عوام الناس پر اپنی خدائی کا تخت بچھاتے ہیں۔ اسی طرح اشتراکیت اب کوئی نظریہ نہیں بلکہ ایک سیاسی حربہ ہے۔ جن کے ذریعہ کچھ انسان نما دیو زمین کے ایک تہائی حصہ میں تقریباً نوے کروڑ انسانوں کا گلا دبائے ہوئے ہیں۔

اشتراکی نظام کے بارے میں یہ تلخ حقیقت اب ''سرمایہ داروں کا پروپیگنڈہ'' نہیں رہی بلکہ

بیسویں کانگریس کے بعد خود روس کے لیڈروں نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔ اس نظام میں جب ایک بار کوئی شخص برسر اقتدار آجائے تو پھر موت کا فرشتہ ہی انسانیت کو اس کے عذاب سے نجات دلا سکتا ہے۔ چنانچہ اسٹالن کو نہ تو معزول کیا جا سکا اور نہ اس کی زندگی میں کسی کو اس کے خلاف بولنے کی جرأت ہوئی۔ اس کے مظالم کو ''تاریخ کے عظیم انصاف'' کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس کے بارے میں کہا گیا ''اسٹالن کلاسیکل کمیونزم کا حقیقی پیرو ہے'' مگر اس کے مرنے کے بعد خود اشتراکی پریس نے یہ تسلیم کیا کہ اسٹالن تاریخ کا سب سے بڑا ظالم انسان تھا۔ اپنی حکومت کے آخری دور میں اس کی خود پسندی نے قابل نفرت شکل اختیار کر لی۔ اس نے خود کو پارٹی اور عوام سے بالاتر کر لیا۔ مرکزی کمیٹی کی رائے پر غور کرنا ترک کر دیا۔ اس نے مطلق العنان طرز حکومت پر عمل کیا''۔[1] روسی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری اول مسٹر خروشچیف (N. Khrushchev) نے اسٹالن کے مرنے کے بعد پارٹی کی بیسویں کانگریس میں 'فروری ۱۹۵۶' ایک تقریر کی جس میں اسٹالن کے جرائم گنائے۔ یہ ایک طویل تقریر تھی جس کے بعض فقرے یہاں درج کیے جاتے ہیں:

''ایک شخص سب کچھ جانتا ہے۔ سب کچھ دیکھتا ہے، ہر فرد سے واقف ہے، ہر کام کر سکتا ہے، اس سے کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ کسی شخص میں اس قسم کی غیر معمولی صفات کو ماننا اسے خدا بنانا ہے۔ مگر اسٹالن کے بارے میں سالہا سال تک ہمارا عقیدہ یہی تھا جس کی تردید اس کے مرنے کے بعد سینٹرل کمیٹی نے کی ہے۔''

''اسٹالن سمجھانا بجھانا نہیں جانتا تھا بلکہ وہ اپنے خیالات کو زبردستی منواتا تھا اور لوگوں سے اندھی اطاعت کا مطالبہ کرتا تھا۔ جس نے بھی اس کی اطاعت نہیں کی یا اس کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ سترہویں پارٹی کانگریس کے بعد خاص طور پر پارٹی کے بہت بڑے بڑے لیڈر اور کارکن اس کی مطلق العنانی کا شکار ہو گئے۔''

''اسٹالن نے 'عوام دشمن' کی اصطلاح ایجاد کی جس کا مطلب خود بخود یہ ہو گیا کہ ایک شخص

---

[1] سوویت لینڈ یکم جون ۱۹۵۶ء

کی رائے خواہ صحیح ہو یا غلط لازماً قبول کی جانی چاہیئے۔اس اصطلاح کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا کہ کوئی شخص جو کسی بھی پہلو سے اسٹالن کی تائید نہ کرتا ہو یا جس کے بارے میں ایسا شبہہ کیا جائے،اس کے خلاف ہر ظالمانہ سلوک کیا جا سکتا ہے اور اس کے خلاف ہر قسم کے تشدد کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔''عوام دشمن'' کی اس اصطلاح کے بعد اختلاف رائے اور کسی معاملہ میں بحث ونظر کے بعد ایک نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا ناممکن ہو گیا۔ایسے تمام مجرمین کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے جو قانونی بنیاد فراہم کی گئی وہ اعتراف (confession) تھا جو جسمانی اذیتوں کے ذریعہ اگلوایا جاتا تھا۔''

''ایک شخص کی من مانی کارروائی نے دوسروں کو بھی مطلق العنان بنا دیا۔بیشمار لوگ گرفتار ہوئے، ہزاروں آدمی جلاوطن کر دیئے گئے۔کسی عدالتی کارروائی اور تحقیق اور تفتیش کے بغیر سزائیں دی گئیں۔اس چیز نے عام طور پر بدامنی اور خوف کی فضا پیدا کر دی اور لوگوں کو مایوس بنا دیا۔''

''حال میں خاص طور پر بیریا کے گروہ کا صفایا کرنے کے بعد سینٹرل کمیٹی نے بہت سے واقعات کی تحقیق کی جو اس گروہ نے اپنے زمانے میں گھڑے تھے۔اس سے اسٹالن کی وحشیانہ خود آرائی کے بارے میں بڑی بھیانک حقیقتوں کا انکشاف ہوا۔معلوم ہوا کہ اسٹالن نے اپنے لامحدود اختیارات کو بہت غلط طریقہ سے استعمال کیا تھا۔وہ سینٹرل کمیٹی کے نام پر کارروائیاں کرتا تھا مگر کمیٹی کے ممبروں سے ان کی رائے تک دریافت نہیں کرتا تھا، نہ کمیٹی کی پولیٹکل بیورو سے مشورہ کرتا تھا۔اکثر نہایت اہم معاملات میں اس نے اپنے ذاتی فیصلوں کی انھیں اطلاع تک نہیں دی۔''

''جنگ کے بعد سات سال تک کوئی کانگریس نہیں بلائی گئی۔''

''یہ واضح ہو چکا ہے کہ بہت سے لوگ جو ۳۸۔۱۹۳۷ میں ''دشمن'' قرار دیئے گئے تھے وہ حقیقتاً دشمن نہیں تھے، نہ جاسوس تھے، نہ توڑ پھوڑ کرتے تھے بلکہ اکثر نہایت وفادار

کمیونسٹ تھے۔ ان کو بدنام کیا گیا اور سخت جسمانی عذاب کے ذریعہ ان سے زبردستی ہولناک جرائم کا اقرار کرایا گیا۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے ۱۳۹ ممبر جو سترہویں کانگرس میں چنے گئے تھے ان میں سے ۹۸ ممبروں یعنی ستر فی صدی کو گرفتار کر کے گولی ماردی گئی۔ یہ انجام صرف سینٹرل کمیٹی کے ممبروں ہی کا نہیں ہوا بلکہ اٹھارویں پارٹی کانگریس کے مندوبین (Delegates) کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا۔ ان کی اکثریت یعنی ۱۹۶۶ مندوبین میں سے ۱۱۰۸ کو ''انقلاب دشمن'' جرائم کے ارتکاب کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔''

''نفرت انگیز بہتان اور مجرمانہ کارروائیوں کی ایک شرمناک مثال ایکے (Eikhe) کا واقعہ ہے جو سینٹرل کمیٹی کی پولیٹکل بیورو کے لیے امیدوار تھا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کا ایک ممتاز کارکن تھا۔ وہ ۱۹۰۵ سے پارٹی کا ممبر تھا۔ ایکے ۲۹/اپریل ۱۹۳۸ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے سرکاری سامان میں خورد برد کیا ہے۔ ایکے کے مقدمہ کی تفتیش جس طرح کی گئی وہ وحشیانہ دروغ بیانی کی ایک بدترین مثال ہے۔ ایکے کو شدید جسمانی عذاب دے کر مجبور کیا گیا کہ وہ اعتراف جرم کی ایک ایسی دستاویز پر دستخط کرے جس کو محکمہ تفتیش کے ججوں نے تیار کیا تھا۔ جس میں وہ اور دوسرے بہت سے ممتاز پارٹی کارکن عوام دشمن سرگرمیوں میں ماخوذ کئے گیے تھے۔ ۴ فروری کو ایکے کو گولی سے مار دیا گیا۔ اس طرح کے اور بہت سے مقدمے ہیں جو محض بہتان اور جعلسازی کی بنیاد پر کھڑے کئے گئے تھے۔''

''جب اسٹالن کسی شخص کے بارے میں کہہ دیتا کہ اس کو گرفتار کر لیا جائے تو اس وقت یہ ایمان لانا ضروری تھا کہ وہ شخص ''عوام کا دشمن'' ہے۔ ان دنوں بیریا کا گروہ جو ریاستی تحفظ کا ذمہ دار تھا، گرفتار شدہ شخص کو مجرم بنانے اور اس کے خلاف اپنے جھوٹے الزامات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے نہایت تیزی سے حرکت کرتا تھا، اور وہ ثبوت کیا ہوتا تھا——

اپنے جرائم کا ''اعتراف''، جس کو محکمۂ تفتیش کا جج فوراً قبول کر لیتا تھا اور یہ کس طرح ممکن ہوتا تھا کہ — ایک شخص ان جرائم کا اقرار کر لے جس کو اس نے سرے سے کیا ہی نہ ہو؟ اس کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ جسمانی مشقتوں کے ذریعہ اس پر دباؤ ڈالا جاتا تھا، اس کو سخت عذاب میں مبتلا کیا جاتا تھا، اس کو ناقابل برداشت تکلیفوں کے ذریعہ نیم بے ہوشی کی حد تک پہنچا دیا جاتا تھا اور اس طرح اس سے ہولناک جرائم کے اقرار نامے پر دستخط لیے جاتے تھے''۔

ہماری فلموں اور ادبی تخلیقات کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ اسٹالن کا پروپیگنڈہ کیا جائے اور اس کی شان میں قصیدے پیش کیے جائیں۔ اس سلسلہ میں فلم ''برلن کی شکست (Tehfallbexlin) کی مثال لیجئے۔ یہ فلم پچھلی جنگ میں روسیوں کے مقابلے میں جرمنوں کی شکست کا منظر پیش کرتی ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ پوری فلم میں صرف اسٹالن کا کردار نظر آتا ہے، وہ ایک ہال میں بیٹھا ہوا احکام جاری کر رہا ہے جہاں بہت سی خالی کرسیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اور ایک شخص کے سوا ہال میں کوئی اور آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ سوال یہ ہے کہ فوجی محکمہ کہاں ہے۔ پولیٹکل بیورو کیا کر رہا ہے، حکومت کس کام میں مصروف ہے۔ یہ لوگ آخر کہاں ہیں اور کس کام کے لیے رکھے گئے ہیں۔ فلم کے اندر ان کے بارے میں کچھ نہیں ہے۔ اسٹالن اکیلا تمام کام کر رہا ہے، اس کو کسی شخص پر اعتماد نہیں ہے۔ وہ کسی سے مشورہ طلب نہیں کرتا، اس فلم میں ہر چیز نہایت غلط رنگ میں دکھائی گئی ہے، کیوں؟ صرف اسٹالن کی شہرت کے لیے، حقیقت اور واقعہ کے بالکل خلاف۔''
(نیویارک ٹائمز۔ ۵ جون ۱۹۵۶ء)[1]

---

[1] اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گریٹ سویٹ انسائیکلو پیڈیا جس کا تازہ ترین ایڈیشن ۱۹۵۸ کے شروع میں ماسکو سے شائع ہوا ہے اس میں اسٹالن کے سرکاری سوانح حیات صرف چھ صفحے پر مشتمل ہیں، جب کہ اس کا پچھلا ایڈیشن جو اسٹالن کے زمانہ میں شائع ہوا اس میں اسٹالن کے لیے ۴۶ صفحات وقف کیے گئے تھے۔ موجودہ ایڈیشن میں اسٹالن کی زندگی کے بعض پہلوؤں کی تعریف کرتے ہوئے اس پر سخت تنقید کی گئی ہے اور اس میں لینن کی وہ مشہور تحریر بھی شائع کر دی گئی ہے جس میں اس نے اسٹالن کو ''ان گھڑ''، وہمی اور اپنے ساتھیوں کے لیے غیر وفادار کہا تھا۔ بحوالہ اسٹیٹس مین (دہلی) ۱۸ فروری ۱۹۵۸۔

اس تقریر میں اسٹالن کے جن ہولناک جرائم کا اعتراف کیا گیا ہے اس نے کمیونزم کے مومنین کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ چنانچہ ان واقعات کی اشاعت کے بعد ساری دنیا میں بہت سے کمیونسٹ ممبر پارٹی سے استعفا دے چکے ہیں۔ امریکہ کا مشہور کمیونسٹ ادیب ہاورڈ فاسٹ (Howard Fast) بھی انھیں استعفا دینے والوں میں ہے جو گزشتہ بیس سال سے پارٹی کا اہم رکن تھا۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:

''خروشچیف کی خفیہ تقریر کی اشاعت سے بہت پہلے میں نے اور کمیونسٹ پارٹی کے دوسرے ممبروں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ عالمی کمیونسٹ تحریک میں کوئی المناک خامی موجود ہے۔ ان باتوں نے مجھ میں اور بہت سے دوسرے لوگوں میں ایک تبدیلی کے رجحان کی ابتداء کر دی تھی، لیکن اس کے باوجود ہم خروشچیف کی خفیہ رپورٹ کے آتشیں اور جہنمی انکشافات کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس دہشت کی حدیں ہمارے خواب وخیال سے بھی پرے تھیں جو سوویت یونین کے دشمن اس پر عائد کرتے تھے۔ میرا دل نفرت اور حقارت سے بھر گیا۔ مجھے اس احساس سے لامحدود ذہنی کوفت ہو رہی تھی کہ میں خون کی اس سفاکانہ ہولی کی تائید کرتا رہا ہوں۔ دوسروں کی طرح مجھے بھی یہ محسوس ہوا کہ میں تاریخ جدید کے ایک ناقابل بیان دھوکے کا شکار ہوا۔''[1]

خروشچیف کی مبینہ رپورٹ جس کے بعض حصے ہم نے اوپر نقل کیے ہیں اس کی اشاعت کے بعد فرانس کی کمیونسٹ پارٹی نے سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی سے مطالبہ کیا تھا کہ اسٹالن کی طرف جو ہولناک جرائم منسوب کیے گئے ہیں ان کی مکمل نظریاتی وضاحت کی جائے۔ اس پر سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ایک طے شدہ بیان جاری کیا جو سوویت لینڈ ۱۵ جولائی ۱۹۵۶ کے ساتھ شکل ضمیمہ نمبر ۱۴ شائع ہوا ہے۔ اس میں اس سوال کی وضاحت کی گئی ہے کہ'' آخر یہ کیسے ممکن ہوا کہ اسٹالن کی ڈکٹیٹر شپ اپنے تمام برے نتائج کے ساتھ سوویت اشترا کی نظام کے حالات میں ابھری

---

[1] ماہنامہ 'تحریک'، (دہلی) جون ۱۹۵۷ء

اوراس طرح پھیل گئی۔ یہ بیان تمام تر تضاد بیانی سے بھرا ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسٹالن ازم کے ابھرنے کے اسباب سوویت سماجی نظام میں نہیں ہیں بلکہ اس کی ذمہ داری تمام تر خود اسٹالن پر ہے اوراس بات پر ہے کہ اشتراکی ریاست کا وزیراعظم بننے کے بعد وہ سماج کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی ذات کی پرستش میں مبتلا ہوگیا اوراپنے کوعوام سے بالاتر کرلیا۔مگر سوال یہ ہے کہ جب اشتراکی حضرات کے دعویٰ کے مطابق روس میں لوٹنے والے طبقوں کوختم کر دیا گیا تھا، جب وہاں ذرائع پیداوار پر سماج کی ملکیت قائم ہوچکی تھی، جب سوویت نظام کے تحت حکومت کے اختیارات کسی ایک شخص کے ہاتھ میں نہیں تھے بلکہ پورے محنت کش طبقہ کی طرف منتقل کر دیئے گئے تھےتو آخر کس طرح ایک شخص وہاں کے تمام اختیارات پر قابض ہوگیا۔ اجتماعی ملکیت کے نظام میں انفرادی ملکیت کی برائیاں کیسے پیدا ہوگئیں، کیا اشتراکیت کے مخالفین کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ اشتراکی نظام ڈکٹیٹرشپ کی بدترین شکل ہے جس کو خوب صورت نظریات کا لباس اڑھا دیا گیا ہے۔ کیا اشتراکی نظام میں بھی اقتدار عوام کے ہاتھ میں نہیں ہوتا بلکہ اس ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو اتفاق سے ریاست کا حاکم منتخب ہو جائے۔ کیا ''مزدور ڈکٹیٹرشپ'' اس کا نام ہے کہ ساری آبادی کومزدور بنا کر محض ایک شخص ان کے اوپر ڈکٹیٹر بن جائے۔ روسی کمیونسٹ پارٹی نے اس واقعہ کی جوتوجیہہ کی ہے وہ مارکسی نظریات کے عین برعکس ہے۔ کیوں کہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اسٹالن کے بگاڑ کے اسباب خوداس کی ذات میں تھے، نہ کہ وقت کے مادی ماحول میں۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں لینن اور اس کے ساتھیوں نے نارودنکوں (روس کا ایک اشتراکی حلقہ) کی اس بنا پر سخت مخالفت کی تھی کہ '' ان کے خیال کے مطابق، تاریخ کا انحصار سماجی طبقوں اور ان کی آپس کی کش مکش پر نہیں بلکہ ان نمایاں افراد (ہیروؤں) پر ہے جن کی عوام الناس آنکھ بند کر کے پیروی کرتے ہیں[1]''۔ مگر آج نارودنکوں کے اسی غلط اور رجعت پسندانہ نظریہ کو اسٹالن ازم کی تاویل وتشریح میں پیش کیا جارہا ہے۔ ان حضرات سے اگر پوچھا جائے کہ ہٹلر کیوں جرمن کا ڈکٹیٹر بن گیا تو وہ کبھی نہ کہیں گے کہ ڈکٹیٹرشپ کے جراثیم ہٹلر کے

[1] ہسٹری آف دی بالشویک پارٹی، صفحہ ۱۲۔ ۱۳

دماغ میں پیدا ہوئے اور یہ محض اس کا شخصی کردار تھا جس کی وجہ سے وہ جرمنی کے سر پر مسلط ہو گیا۔ وہ ہمیشہ یہی کہیں گے اور یہی کہتے رہے ہیں کہ ڈکٹیٹرشپ کے ظہور کے اسباب اس طریق پیداوار میں ہیں جو ملک کے اندر موجود تھا۔ ہٹلر کی ظالمانہ حکومت اس کے انفرادی عمل کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ وہ دراصل پیداوار اور تبادلہ کے اس طریقہ کا لازمی نتیجہ تھی جو اس وقت جرمنی میں رائج تھا۔ ہٹلر دراصل کوئی شخصی کردار نہیں تھا بلکہ جرمنی کے ظالمانہ طریق پیداوار نے مفاد کے تحفظ کے لیے ہٹلر کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مارکس کا تو سارا فلسفہ یہی ہے کہ افراد محض وقت کے مادی حالات میں کھلونا ہوتے ہیں۔ مارکسی مفکرین ہمیشہ تاریخ کے اس تصور کا مذاق اڑاتے رہے ہیں کہ افراد بھی اپنے ارادہ سے حالات کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ مگر روس میں پیداوار کی تقسیم کے نظام کی تبدیلی کے بعد جب یہی چیز رونما ہوئی تو اس کی ذمہ داری انھوں نے ایک شخص پر ڈال دی تاکہ اشتراکی طریق پیداوار پر حرف نہ آئے۔ حالاں کہ یہ واقعہ کھلا ہوا اس بات کا ثبوت تھا کہ یا تو مارکس کا یہ نظریہ غلط ہے کہ انسان کا ذہن اور اس کا کردار ویسا ہی بنتا ہے جیسا اس کا مادّی ماحول ہو، یا اشتراکی طریق پیداوار میں بھی اسی طرح ظلم و جبر اور استحصال کا نظام جاری رہتا ہے، جیسا کہ سرمایہ دار سوسائٹی میں ہوتا ہے۔ ورنہ جب روس میں مارکسی نظریہ کے مطابق، معاشی حالات بدل دیئے گئے تو وہاں ڈکٹیٹرشپ کیوں ابھری۔

ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ تک روس کے بارے میں یہ پروپیگنڈا کیا جاتا رہا کہ وہاں ملکیتیں سارے سماج کے قبضہ میں دے دی گئی ہیں۔ وہاں انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ختم ہو گیا ہے۔ وہاں ریاست ظلم و جبر کا آلہ نہیں بلکہ عوام کی خادم ہے۔ وہاں حکومت اور رعایا کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔ مگر جب پردہ اٹھا تو معلوم ہوا کہ یہ سب محض جھوٹا پروپیگنڈا تھا۔ اسٹالن جو اس پورے عرصہ میں اس نظام کا حاکم اعلیٰ تھا وہ اول درجہ کا ظالم اور خودغرض ثابت ہوا۔ بیریا مالوٹوف، مالنکوف، شیپلوف، کگانووچ زوکوف اور بہت سے دوسرے لوگ جو اسٹالن کی رفاقت میں سارے نظام کو چلا رہے تھے، سب کے سب انسانیت کش اور سماج کے دشمن نکلے۔ انگلینڈ یا امریکہ میں اگر کوئی حکومت بگڑ جائے تو پبلک میں طوفان مچ جائے گا۔ مگر اشتراکی نظام نے ان ظالموں کو اس قدر

اختیارات دے دیئے تھے کہ ملک کے اندر کوئی ایک زبان بھی اس کے خلاف بولنے کی جرأت نہ کر سکی، نہ پریس سے اس کے بارے میں کوئی مضمون شائع ہوا۔ سوویت یونین کی سوویتوں کی آٹھویں کانگریس منعقدہ ۲۵ ؍نومبر ۱۹۳۶ میں جب اسٹالن نے اعلان کیا کہ روس میں انسانوں کے ہاتھوں انسان کا استحصال ختم ہو گیا ہے'' تو حاضرین بہت دیر تک تعریف و تحسین کے نعرے لگاتے رہے۔ اسٹالن کی زندگی تک یہ حال تھا کہ روس میں ہر تقریر کو خواہ وہ کسی بھی موضوع پر ہو، ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا جاتا تھا'' زندہ باد اسٹالن'' پائندہ باد اسٹالن''۔ تقریر کے اختتام کا یہ انداز تقریر کی کامیابی کا ضامن تھا۔ کیوں کہ ایسے جملہ کے بعد مسلسل تالیاں اور مسرت کے فلک شگاف نعرے لازمی تھے۔ مگر یہی اسٹالن اپنی موت کے تین سال کے بعد قاتل لٹیرا اور اناڑی سیاست داں جیسے خطاب سے نوازا گیا۔ ۳۵ سال تک اعلان کیا جاتا رہا کہ'' سوویت طرز کی حکومت تاریخ کا بہترین طرز حکومت ہے[1]'' ''سوویت یونین میں سارا اقتدار ملک کے جائز مالکوں یعنی محنت کشوں کے ہاتھ میں ہے''۔۔۔ ''۲۰ کروڑ سوویت عوام انسانی تاریخ میں وہ پہلے انسان ہیں جو اپنے ملک کے ایک آزاد ملک کی تمام تر دولت کے پورے طور پر مالک ہو گئے ہیں۔'' مگر جب پردہ اٹھا تو معلوم ہوا کہ اس سے بدتر نظام حکومت شاید تاریخ میں کبھی وجود میں نہیں آیا تھا۔

کمیونزم کے بعض عقیدت مند یہ دلیل دیتے ہیں کہ ہم نے مانا کہ اسٹالن نے انقلاب کے ساتھ غدّاری کی، مگر اس سے اشتراکی اصولوں کی حقانیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ نظریہ الگ چیز ہے اور اس کو ماننے والے افراد کا کردار بالکل علٰیحدہ چیز ہے۔ اگر کسی نظریہ کو ماننے والے افراد بگڑ جائیں تو اس سے اصل نظریہ کے غلط ہونے پر کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر تو بالکل صحیح ہے مگر اس سے ان لوگوں کے نظریہ کی تائید نہیں ہوتی جو اس کو پیش کر رہے ہیں۔ ایک ایسا نظریہ جو افراد کے کردار کو خود افراد کے اپنے ارادہ و شعور کا نتیجہ قرار دیتا ہو، جس کے نزدیک افراد وہی کچھ کرتے ہیں جو وہ خود کرنا چاہتے ہوں۔ اس کے بارے میں تو ضرور یہ کہا

[1] سوویت ڈیماکریسی اینڈ بورژوا ڈیماکریسی صفحہ ۴

جا سکتا ہے کہ نظریہ کو ماننے والے افراد کے بگڑ جانے سے اس نظریہ کی خرابی ثابت نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ نظریہ افراد کو ایک با اختیار ہستی تسلیم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک افراد اسی حد تک اصلاح یافتہ ہوں گے جس حد تک وہ خود نظریہ کو اختیار کریں۔ مگر مارکسزم تو اس کے بالکل برعکس ایک نظریہ ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ شعور بذات خود کوئی چیز نہیں وہ صرف اپنے مادی ماحول کی پیداوار ہے۔ دوسرے لفظوں میں آدمی جو کچھ کرتا ہے اس لیے نہیں کرتا کہ وہ اپنے ارادہ وشعور کے تحت ایسا کرنا چاہتا ہے بلکہ اس لیے کرتا ہے کہ وقت کے مادی حالات نے اس سے کرنے کے لیے کہا ہے۔ پہلے قسم کے نظریہ کا کہنا ہے کہ ''انسان کو بدلنا چاہتے ہو تو اس کی فکر کو بدل دو، اس کے برعکس مارکس کا کہنا ہے کہ انسان کو بدلنا چاہتے ہو تو اس کے معاشی حالات کو بدل دو۔'' پہلی صورت میں بہتر حالات لانے کے لیے انسان کے رجحانات اور تصورات کو بدلنے پر ساری کوشش صرف کی جائے گی تا کہ وہ اس کے لیے تیار ہو سکے کہ اپنے ارادہ کو غلط سمتوں سے بچا کر صحیح سمت میں لگائے۔ اس کے برعکس مارکسزم کے نزدیک اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ معاشی حالات کو بدلا جائے۔ اس کے نزدیک معاشی حالات ہی سے شعور اور ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے جب معاشی حالات بدل دیئے جائیں تو خود بخود شعور تبدیل ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں جب کسی علاقے میں معاشی حالات اور لین دین کے طریقہ کو تبدیل کر دیا جائے تو خود بخود انسان کو بھی بدل جانا چاہئے۔ اگر معاشی حالات کی تبدیلی کے بعد بھی انسان نہ بدلیں تو یہ سمجھا جائے گا کہ خود وہ نظریہ غلط تھا جس کے تحت سماج کی اصلاح کے لیے معاشی حالات کو بدلنے کا پروگرام وضع کیا گیا تھا۔ وہ فرد کی خرابی نہیں بلکہ خود نظریہ کے غلط ہونے کا ثبوت ہے۔ پہلی قسم کے نظریہ کے تحت قائم شدہ نظام میں اگر افراد کی اصلاح نہ ہو تو کہا جائے گا کہ افراد نے پوری طرح نظریہ قبول نہیں کیا ہے۔ ان کے ارادہ پر ابھی تک نظریہ کی حکمرانی قائم نہیں ہوئی ہے۔ وہ انانیت اور خود پرستی کا شکار ہیں۔ اس کے برعکس مارکسی نظریہ کے تحت قائم شدہ نظام میں اگر افراد کی اصلاح نہ ہو تو اس سے خود نظریہ کی تردید ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مادہ شعور نہیں پیدا کرتا بلکہ شعور مادہ سے الگ ایک مستقل چیز ہے جو خود مادہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مارکسزم شعور کو بالکل مادہ کی مخلوق تسلیم نہیں کرتی بلکہ اس کی مستقل بالذات حیثیت کا بھی اقرار کرتی ہے، جیسا کہ مارکس کی وفات کے بعد اس کے رفیق فریڈرش انگلس نے مسٹر جوزف بلاک کے نام اپنے خط مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۸۹۰ میں لکھا تھا۔ مگر یہ تاویل اختیار کرنا مارکسزم کی بنیاد ہی کو سرے سے ڈھا دینا ہے۔ مارکس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انسانی تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان مسلسل کش مکش اور لوٹ کھسوٹ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس معاشی نظام کو بدل دیا جائے جو اس دائمی فساد کا ذمہ دار ہے اور جس میں نامعلوم مدت سے انسان زندگی گزارتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے نزدیک انفرادی ملکیت کے نظام کو اجتماعی ملکیت کی شکل دے دینے کہ معنیٰ یہ تھے کہ خود انسان کے اخلاق اور کردار کو بدل دیا گیا ہے۔ لیکن اگر اس مادی تبدیلی کے بعد بھی انسان کا شعور نہیں بدلتا جیسا کہ انگلس اور دوسرے اشتراکی مفکرین نے مارکس کے نظریہ کی توجیہہ کرتے ہوئے کہا ہے۔ اگر اشتراکی سماج میں انسان کے لیے یہ موقع باقی رہتا ہے کہ وہ اسی طرح لوٹ کھسوٹ کی باتیں سوچ سکے جس طرح وہ غیر اشتراکی نظام میں سوچتا ہے تو پھر کس بنا پر یہ توقع کی جائے کہ اشتراکی نظام میں استحصال کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ انسانی شعور کی مستقل بالذات حیثیت تسلیم کرنے کے معنیٰ دراصل یہ ہیں کہ ملکیتی نظام کی تبدیلی کے بعد بھی یہ خطرہ باقی ہے کہ انسان کے اندر انحراف پیدا ہو اور سماج کے کچھ لوگ موقع پا کر سماج کے سروں پر مسلط ہو جائیں، جس طرح ہٹلر جرمنی کے اوپر مسلط ہو گیا تھا۔ مارکس نے جمہوری نظام کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ اس میں افراد کے لیے یہ موقع باقی رہتا ہے کہ نئے عنوان سے وہ سماجی اختیارات پر قابض ہو جائیں۔ پھر جب اشتراکی نظام میں بھی افراد کے لیے یہ موقع باقی رہا کہ وہ چاہیں تو عوام کی گردن پر سوار ہو جائیں اور اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک سارے سماج کو اپنا غلام بن کر رہنے پر مجبور کر دیں تو دونوں میں فرق کیا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ مارکس کے نظریہ کو اگر خود اس کے الفاظ کے مطابق، بالکل ٹھیٹ شکل میں مانا جائے تو تجربہ نے اس کی تردید کر دی ہے اور اگر انگلس اور دوسرے مارکسی مفکرین کی تشریح کے مطابق اسے مانا جائے تو پھر کسی تجربہ کی ضرورت نہیں، یہ نظریہ اپنی تردید آپ کر رہا ہے۔

مزدور کا کردار سرمایہ دار طبقہ کے کردار سے مختلف نہیں:

سرمایہ دار طبقہ مارکس کی شریعت میں ٹھیک وہی مقام رکھتا ہے جو الٰہی شریعتوں میں شیطان کا ہے۔ وہ سرمایہ دار طبقہ کو بحیثیت طبقہ کے ختم کر دینا چاہتا ہے۔ کیوں کہ اس کے نزدیک وہی ساری برائیوں کی جڑ ہے اور سماجی انتظام کے تمام مواقع محنت کش طبقہ کے حوالے کر دینے کا علم بردار ہے۔ مگر ''سرمایہ دار'' کون ہے۔ یہ اب تک واضح نہیں کیا جا سکا۔ مارکس پورے زور وشور کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسانی تاریخ دو طبقات میں بٹی ہوئی ہے اور صنعتی انقلاب کے بعد تو اس کے نزدیک یہ تقسیم بالکل واضح ہو گئی ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں ''جن کے پاس سب کچھ ہے'' اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں ''جن کے پاس کچھ بھی نہیں''۔ مگر کیا یہ بات اتنی ہی واضح ہے جتنی کہ مارکس اسے بتاتا ہے۔ کیا حقیقتاً انسانوں کے درمیان ایسا کوئی خط کھینچنا ممکن ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکیں کہ اس کے اس پار جو لوگ ہیں وہ سرمایہ دار ہیں اور اس پار غیر سرمایہ دار۔ اشتمالی منشور میں سرمایہ دار طبقہ کو انسانی آبادی کا صرف دس فیصدی حصہ بتایا گیا ہے۔ اشتراکیت پر جبر وتشدّد کے الزام کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تاریخ کے پچھلے ادوار میں اقلیت نے اکثریت پر ظلم کیا تھا۔ اب جو مزدور انقلاب آرہا ہے۔ اس میں اکثریت ایک محدود اقلیت کو دبا کر رکھے گی۔ مگر عملاً جب روس میں ''محروم طبقہ'' نے اقتدار حاصل کیا اور سرمایہ داروں کو ایک ''طبقہ'' کی حیثیت سے ختم کرنے کی مہم شروع ہوئی تو وہ نہ زار پر رکی، نہ جاگیرداروں اور کارخانہ داروں پر، بلکہ دن بدن اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ملک کی بیشتر آبادی جو چھوٹے چھوٹے قطعات پر کھیتی کرنے والے کسانوں پر مشتمل تھی۔ ان سب کو آخری اور ''امکانی سرمایہ دار'' قرار دے دیا گیا اور صرف یہی نہیں بلکہ خود جدلیاتی فلسفہ کے مومنین، یعنی کمیونسٹ پارٹی کے بے شمار ارکان ''سرمایہ داروں کے ایجنٹ'' نکلے جن کے خاتمے کے لیے وسیع پیمانے پر ''صفائی'' کی مہم جاری کرنی پڑی۔ پچھلی دو بڑی لڑائیوں کے درمیانی دور میں سوویت روس کے اندر پندرہ لاکھ سے بیس لاکھ پارٹی ممبروں کا صفایا کیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں لینن نے مرکزی کمیٹی کو یہ مشورہ دیا کہ پارٹی کو تمام ''بدمعاشوں، نوکر شاہی ذہنیت رکھنے والوں، بے ایمان اور مذبذب کمیونسٹوں'' سے پاک کر دیا

جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ میں مرکزی کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق، ایک عام اخراج کا انتظام کیا گیا جس میں تقریباً ایک لاکھ ستر ہزار ممبر نکال دیئے گئے۔ اور یہ تعداد اس وقت کے پارٹی ممبروں کی تعداد کا ۲۵ فیصدی تھی[۱]۔ دوسرے کمیونسٹ ممالک کا حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ پھر سرمایہ دارانہ جراثیم کا سلسلہ یہاں بھی نہ رکا، بلکہ وہ لوگ جنھیں ''اشتراکی محنت کے ہیرو'' کا خطاب ملا تھا۔ جو پچھلے چالیس سال سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک سرمایہ دار کا خاتمہ کر رہے تھے۔ جب پردہ اٹھا تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی بورژوا کے انڈے بچے ہیں۔ اسٹالن، مولوف، بیریا، کگاپووچ اور دوسری نمایاں ترین شخصیتیں محنت کش طبقہ کی دشمن اور سرمایہ داروں کی ایجنٹ نکلیں۔ یہاں تک کہ آدھی صدی کی مار دھاڑ اور ''عظیم اشتراکی تعمیر'' کے باوجود کمیونسٹ سرزمین میں ''سرمایہ داری کے بچے کھچے عناصر'' اب تک موجود ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ اس بچے کھچے عناصر کی نامعلوم فہرست میں کل کس کمیونسٹ لیڈر یا وزیر کا نام نکل آئے گا۔

مارکسزم کا یہ بہت بڑا تضاد ہے کہ ایک طرف وہ سرمایہ دار طبقہ کو گردن زدنی قرار دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ سماج کا دشمن ہے اور انتظامِ ملکی کی ذمہ داری مزدور لیڈروں کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ اس کے خیال میں مزدور طبقہ ہی سماج کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ طبقہ ہے وہ جدلیاتی شعور رکھتا ہے اس کو تاریخ نے اس مقام پر کھڑا کیا ہے کہ ''اپنی نجات کی کوشش میں سارے سماج کو نجات دے دے'' پھر ''کمیونسٹ پارٹی'' اس دودھ کا مکھن ہے، وہ محنت کش طبقہ کا ہراول دستہ ہے۔ وہ مزدوروں کی طبقاتی تنظیم کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ اس میں مزدور طبقہ کے بہترین عناصر جمع ہو گئے ہیں۔ اس لیے وہی اس قابل ہے کہ اس کے ہاتھ میں سماجی معاملات کی زمام کار دی جائے۔ مگر دوسری طرف مارکسزم کے علمبردار خود اپنے عمل سے مسلسل یہ ثابت کرتے رہے ہیں کہ اشتراکی نظریہ کی یہ تشریح صحیح نہیں ہے۔ مزدور طبقہ اور کمیونسٹ پارٹی دونوں اسی طرح بالکل ناقابلِ اعتبار ہیں جس طرح ان کے بیان کے مطابق سرمایہ دار طبقہ۔ مزدوروں کی معصومیت صرف اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ بے بس

---

[۱] ہسٹری آف دی کمیونسٹ پارٹی (B) صفحہ ۲۷۶ بمبئی ۱۹۴۴ء۔

ہوں۔اسی طرح کمیونسٹوں کی حقیقت بھی صرف اسی وقت تک چھپی رہتی ہے جب تک ان کی سیرت ظاہر ہونے کا کوئی موقع نہ ملے۔ جہاں کہیں موقع ملا وہ کسی اعتبار سے بھی سرمایہ داروں سے کم لٹیرے اور ظالم ثابت نہیں ہوتے۔

سب سے پہلے مارکس کے ہم عصر اشتراکیوں اور مزدور لیڈروں کو لیجئے۔ وہ اگر چہ محنت کش طبقہ کے وکیل اور سوشلسٹ طرز پر زندگی کے مسئلہ کو حل کرنے کے علم بردار تھے مگر مارکس اور انگلس نے ان کا مذاق اڑایا۔ انھوں نے کہا کہ یہ لوگ سرمایہ داری کی اولاد ہیں۔ وہ نظریہ باز اور رجعت پسند ہیں۔ انھوں نے وقت کے ظالم حکمرانوں سے ساز باز کر رکھی ہے۔ وہ مزدوروں کے مقابلے میں اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ بورژوا پر تنقید کرتے ہیں مگر ''عملی سیاست میں وہ مزدوروں پر جبر وتشدد کرنے والوں کی حمایت کر رہے ہیں۔'' اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے سرمایہ دار طبقہ سے مصالحت کر لیتے ہیں، ان کی اشتراکیت کا آخری مقصود صرف یہ ہے کہ مزدور کو مطمئن کر کے اسے سرمایہ دار کے خلاف کش مکش کرنے سے باز رکھیں تا کہ سرمایہ دار بے خوف وخطر اپنی لوٹ جاری رکھ سکیں۔ دوسری انٹرنیشنل ـــــ مزدور طبقہ کی بین الاقوامی جماعت جو ۱۸۸۹ میں قائم ہوئی، جس میں تمام دنیا کے مزدور شریک تھے۔ اشتراکی حضرات کے قول کے مطابق، پہلی جنگ عظیم کے موقع پر ایک دو کے سوا اس کے تمام نمائندوں نے مارکسی نظریات سے ''غداری'' کی۔ وہ لوٹ کھسوٹ کرنے والے سرمایہ داروں کے ایجنٹ بن گئے اور انھوں نے محنت کش طبقہ کے عالمی مفاد کے خلاف کام کیا اور ''نہایت شرمناک طریقہ پر'' تنظیم کو ختم کر دیا۔ انھوں نے ''موقع پرستی'' اختیار کی اور ''سیاسی سودے بازی'' میں مبتلا ہو گئے۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی، روسی مزدوروں کی جماعت جو انقلاب سے پہلے لینن کی رہنمائی میں قائم ہوئی تھی، اس میں ایک بہت بڑا گروہ جو اگر چہ منشویک (اقلیت) کہا جاتا ہے، مگر درحقیقت وہ نصف کے قریب تھا۔ ۱۹۱۲ میں جو چوتھی دوما (زار کے زمانے کی روسی پارلیامنٹ) منعقد ہوئی تھی اس میں منشویک کے نمائندے سات اور بالشویک کے صرف چھ تھے۔ جون ۱۹۱۷ میں تمام ملک کے سوویتوں کی پہلی کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کانگریس میں بالشویک کے مقابلہ میں منشویک نمائندے

اکثریت رکھتے تھے۔اس کا حال یہ ہوا کہ اس نے'' وقت کے ہر اہم مسئلہ پر مارکسزم سے انحراف کیا اور بالآخر انقلاب دشمنی کی راہ اختیار کی''۔ پارٹی کی دوسری کانگریس (لندن ، ۱۹۰۳) میں یہ لوگ ایک گروہ کی شکل میں ظاہر ہوئے اور پراگ کانفرنس ـــــ (۱۹۱۲ء) میں انھیں پارٹی سے خارج کر دیا گیا۔ روس کے چوٹی کے لیڈر جنھوں نے لینن کے ساتھ ''عظیم اشتراکی انقلاب'' کے لیے جدوجہد کی تھی، جو کمیونسٹ پارٹی کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز تھے، انہوں نے'' غداری'' کی اور ایسے جرائم کے مرتکب ہوئے جن کی سزا قتل تھی۔ اس میں'' روس میں مارکسیت کا بانی'' جارج وی پلخیوف سے لے کر لینن کے بعد بالشویک پارٹی کا سب سے بڑا لیڈر ٹراٹسکی' کمیساروں کی کمیٹی کا صدر کامانیف کنٹرل اور سینٹ پیٹرز برگ سوویت کا صدر زنیوویف، اخبار پراودا کا چیف ایڈیٹر اور کمنٹرن کی انتظامی کمیٹی کا ممبر بخارن' ٹریڈ یونین کونسل کا صدر ٹومسکی جیسے لوگ شامل ہیں۔ یہ سب کے سب اپنی مذکورہ بالا حیثیتوں کے علاوہ پولٹ بیورو کے رکن بھی تھے۔ ان کے علاوہ بے شمار مزدور، کسان اور کمیونسٹ خود اشتراکی بیان کے مطابق'' غدار'' اور'' عوام دشمن'' ہوگئے۔ لینن کے بعد روسی کمیونسٹ پارٹی کے اعلیٰ ترین لیڈروں میں سے کوئی بھی غداری سے نہیں بچا۔ یہی حال دوسرے ان تمام ملکوں کا بھی ہوا ہے جہاں کمیونزم نے عملاً غلبہ حاصل کیا ہے۔ کمیونسٹ ممالک میں ایک برسر اقتدار شخص کے سوا ہر ایک کی وفاداری مشتبہ رہتی ہے اور کسی بھی وقت وہ ہولناک جرائم کے الزام میں گرفتار کیا جا سکتا ہے اور جب اس صاحب اقتدار شخص کی حکومت ختم ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود سب سے بڑا غدار تھا۔

یہ اشتراکی ملکوں کے حالات ہیں جن کو خود اشتراکی حضرات بڑے زور وشور کے ساتھ نشر کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ کہتے ہوئے شاید وہ بھول جاتے ہیں کہ اس طرح وہ خود اپنے نظریہ کی تردید کر رہے ہیں۔ وہ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ خود غرضی اور لوٹ کھسوٹ میں مزدور طبقہ اور کمیونسٹ پارٹی کے لوگ کسی طرح بھی سرمایہ داروں سے پیچھے نہیں ہیں۔ جہاں آج سرمایہ دار طبقہ ہے وہاں اگر ان حضرات کو بٹھا دیا جائے تو سرمایہ داروں سے بڑھ کر ظالم اور لٹیرے ثابت ہوں گے۔ پھر ایسے ناقابلِ اعتماد لوگوں کے ہاتھ میں سارے ذرائع ووسائل کا چارج دینا کس طرح کسی بہتر نظام کا سبب بن سکتا ہے؟

سیاسی جبر

پھر اس تضاد کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ایک طرف اشترا کی ملکوں سے آئے دن ''انقلاب دشمن'' سرگرمیوں کی اطلاعات آتی رہتی ہیں، جن میں بے شمار آدمی جیل یا پھانسی کی سزا کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں، دوسری طرف جب وہاں انتخابات ہوتے ہیں تو تمام سرکاری امیدوار سو فی صدی ووٹوں سے کامیاب ہوجاتے ہیں، گویا کہ وہاں جولوگ برسراقتدار طبقہ کے مخالف ہیں ان کی مخالفتیں صرف اس وقت کام کرتی ہیں جب ان کا دشمن ان کے سر پر مسلط ہو چکا ہو، اور جب اس دشمن کو آئینی طور پر بدلنے کا موقع آتا ہے تو وہ اپنی مخالفت کو ختم کر کے دوبارہ اپنے انھی دشمنوں کے حق میں رائے دے کر انھیں سو فی صدی ووٹوں سے کامیاب بنا دیتے ہیں۔ آپ اخبار میں پڑھیں گے کہ فلاں کمیونسٹ ملک میں وزیر کے مکان پر بم پھینکا گیا۔ ''کمیونسٹوں کو قتل کر دو'' کے نعرے لگائے گئے۔ کمیونسٹ ریڈیو اعلان کرے گا کہ ملک میں ایک ''انقلاب دشمن تنظیم'' کا انکشاف ہوا ہے جو خفیہ طور پر تمام شہروں اور صوبوں میں کام کر رہی تھی۔ جس کا مقصد کمیونسٹ حکومت کا تختہ الٹنا اور تمام کمیونسٹوں کو قتل کر دینا تھا۔ آپ سنیں گے کہ ہزاروں آدمی اشترا کی جنت سے فرار ہو رہے ہیں۔ بڑے بڑے کامریڈ جن کے بارے میں کل تک عوام کا لیڈر ہونے کا دعویٰ کیا جاتا تھا، سازش کا مجرم قرار دے کر انھیں پھانسی دے دی جائے گی یا وہ خود'' پارٹی سے غداری کے اظہار کے طور پر'' خودکشی کر لیں گے۔ وزیر اور عہدیدار جو عوام کی حمایت سے چنے گئے تھے ان کو ہولناک سازش کے الزام میں گرفتار کر کے گولی ماردی جائے گی۔'' ''صفائی'' کی مستقل مہم جاری کی جائے گی جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ملک میں ایسے بہت سے اشخاص موجود ہیں جو کمیونزم کے مخالف ہیں اور اب انھیں پتہ لگا کر ختم کیا جارہا ہے۔ ہڑتال اور بغاوتیں ہوں گی، کمیونسٹ دشمن مظاہرے ہوں گے، حکومت کے خلاف بڑی بڑی سازشیں پکڑی جائیں گی جن میں یہ بھی انکشاف کیا جائے گا کہ یہ سازش پچھلے ''۳۰ سال سے خفیہ طریقہ پر کام کر رہی تھی۔'' ہزاروں لاکھوں آدمی اس بات کے مجرم قرار دیئے جائیں گے کہ وہ اس اسکیم کے مخالف ہیں جو کمیونسٹ پارٹی ملک میں نافذ کرنا چاہتی ہے۔ یہ سب کچھ ہوگا، اور اس سے کہیں

زیادہ جو کسی آزاد جمہوری ملک میں ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود حکومت بدلنے کی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔ سرکاری طور پر انتخابات کے جو نتائج شائع کیے جائیں گے اس میں ہمیشہ یہی لکھا ہوا ہوگا کہ ''کمیونسٹ پارٹی کے امیدواروں کو ۹۹/۵۲ فی صد ووٹ ملے[1]'' ۱۹۴۷ میں روس کے مختلف صوبوں میں سپریم سوویت کا جو انتخاب ہوا تھا اس میں ووٹروں کی ۹۹/۷ ۹ فی صدی تعداد نے اپنا حق رائے دہندگی استعمال کیا جس میں کمیونسٹ پارٹی کے امیدواروں کو ــــ جن کے سوا کمیونسٹ ملکوں میں حقیقتاً کوئی امیدوار ہوتا ہی نہیں ــــــ ۹۹ فی صدی ووٹ ملے۔ اسی سال سپریم سوویت کی صدارت کے انتخاب میں سو فی صدی ووٹ استعمال کیے گئے جو سب کے سب اسٹالن کے حق میں تھے۔ ایک ووٹ نہ تو استعمال ہونے سے باقی رہا اور نہ اسٹالن کی مخالفت میں دیا گیا۔

سوویت یونین کے دستور کی دفعہ ۱۲۵ میں روسی شہریوں کو تقریر و تحریر اور جلسہ و جلوس کی آزادی دی گئی ہے۔ دفعہ ۱۲۶ میں یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ انجمنیں بنائیں، سیاسی تنظیمیں قائم کریں۔ مگر آج تک وہاں کے شہریوں نے اس حق کو حکومت کے خلاف استعمال نہیں کیا۔ جب سوال کیا جاتا ہے کہ روسی شہری ایسا کیوں نہیں کرتے تو جواب ملتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کو ''بنیادی طور پر'' حکومت کی پالیسی سے کوئی اختلاف نہیں ہے، اس لیے اس حق کو حکومت کے خلاف استعمال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک طرف یہ اعلان ہوتا ہے اور دوسری طرف ہزاروں لاکھوں آدمی حکومت کے خلاف خفیہ کارروائیوں کا ملزم قرار دے کر جیلوں میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں یا گولی مار کر ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔ کمیونسٹ ممالک میں جو لوگ حکمراں طبقہ کے مخالف ہیں، کیا وہ اتنی موٹی سی بات بھی نہیں جانتے کہ جب جمہوری اور آئینی طریقہ پر حکومت کے خلاف کام کرنا ممکن ہو تو خفیہ اسکیمیں چلانا خود ہی اپنی اسکیم کو فنا کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔ یہ لوگ پریس کے ذریعہ اپنے خیالات کی تبلیغ نہیں کرتے، جلسے اور تقریروں میں آواز بلند نہیں کرتے، انتخاب کے آئینی طریق کار سے کام لے کر حکومت بدلنے کی جدو جہد نہیں کرتے۔ کیوں کہ یہ سب کامیابی کے راستے ہیں۔ وہ سازشوں اور خفیہ تنظیموں ہی کا راستہ

[1] سوویت ڈیماکریسی اینڈ بورژوا ڈیماکریسی صفحہ ۴۰۔ ۴۳ (ماسکو ۱۹۵۰)

اختیار کرتے ہیں تا کہ حکومت انھیں غیر قانونی کارروائی کے الزام میں ماخوذ کر کے ختم کر دے۔ زندگی اور موت ــــــ دونوں راستے کھلے ہوئے ہیں، مگر یہ لوگ اس قدر احمق ہیں کہ جان بوجھ کر موت کے راستے کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہ دراصل سب سے بڑا تضاد ہے جس میں تمام کمیونسٹ ممالک مبتلا ہیں۔ جن ملکوں میں کمیونسٹ انقلاب کامیاب ہوا ہے، اس کے تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کمیونزم دراصل دنیا کا بدترین سماجی نظام ہے۔ اس سے زیادہ برا نظام اب تک کسی نے ایجاد نہیں کیا تھا۔ وہاں کی پبلک شدید عذاب میں مبتلا ہے اور کمیونسٹ شکنجہ کو توڑ کر پھینک دینا چاہتی ہے۔ مگر کمیونسٹ حضرات کی خواہش ہے کہ اس بدترین نظام کو تاریخ کا بہترین نظام ثابت کر دکھائیں۔ وہ اپنے ملک کی انتہائی بیزار پبلک کو حکومت کے انتہائی وفادار کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کمیونسٹ ممالک کے حالات پوری طرح سازگار تھے۔ کمیونسٹ ملکوں میں پریس پر حکومت کا مکمل قبضہ ہے۔ وہ ملک کے اندر سے کسی تردید کے خوف کے بغیر جو کچھ چاہے نشر کر سکتی ہے۔ وہ اگر ایسے اعلان کرے جو ملک کی پوری آبادی کی خواہشات کے خلاف ہوں تو سارے ملک میں اس کا کوئی باشندہ اس کے خلاف ایک بیان بھی شائع نہیں کر سکتا۔ چنانچہ کمیونسٹ حکومتوں نے ایک منظّم اسکیم کے تحت مسلسل یہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے کہ کمیونسٹ ممالک کی حکومتیں دنیا کی بہترین حکومتیں ہیں اور ان کو اپنے ملک کے باشندوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ چونکہ کمیونسٹ ممالک میں ہر شخص کا رزق براہ راست حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے انتخابات کے موقع پر لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ کمیونسٹ نمائندوں کے حق میں اپنا ووٹ دیں کیونکہ ان کی مخالفت کرنے کے معنیٰ دراصل موت کے ہیں۔ اس طرح اپنے حق میں جبری رائیں حاصل کر کے کمیونسٹ حکومتیں یہ اعلان کرتی ہیں کہ ان کے ملک کی ساری پبلک ان کے ساتھ ہے اور ان پر پورا اعتماد کرتی ہے۔ مگر جبراً اور جھوٹے پروپیگنڈے سے کسی ملک کے واقعی حالات کو بدلا نہیں جا سکتا۔ حکومتیں سماجی انصاف کا اعلان کرتی ہیں مگر حقیقۃً وہاں سماجی ظلم پایا جاتا ہے۔ لوگ بظاہر حکومتوں کی تائید کرتے ہیں۔ مگر دلوں کے اندر حکومت کے خلاف آگ سلگ رہی ہے۔ بیلٹ پیپر پر

لوگ نمائندوں کے حق میں رائے درج کرتے ہیں مگر اندر اندر مستقل طور پر جوابی انقلاب کی خواہش امنڈ رہی ہے۔ چنانچہ تمام کمیونسٹ ملکوں میں حکومت کا مستقل کام یہ ہے کہ وہ ایسے افراد کو ڈھونڈ کر نکالے جو موجودہ نظام سے بیزار ہیں اور اس کو بدل کر دوسری بہتر حکومت لانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اخبارات میں آئے دن یہ اطلاع آتی رہتی ہے کہ فلاں کمیونسٹ ملک میں ایک سازشی گروہ کا انکشاف ہوا ہے جو حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہتا تھا اور بڑے بڑے لیڈر اور حکام اس الزام میں گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔

کمیونسٹ حکومتوں کی اس دوطرفہ کارروائی نے خود ہی ان کے جھوٹ کا پول کھول دیا ہے۔ اس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ کمیونسٹ حکومتوں کا یہ دعویٰ محض جھوٹا دعویٰ ہے کہ ان کے علاقہ میں پبلک پوری طرح مطمئن ہے اور حکومت سے اس قدر اتفاق رکھتی ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے سوا کسی دوسری پارٹی کے بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ ظاہر ہے کہ اگر پبلک کے اطمینان کا وہی حال ہے جو آپ بتاتے ہیں تو جوابی انقلاب کی کوشش نہیں ہونی چاہئے۔ جن میں خود آپ کے اقرار کے مطابق آپ کے ملک کے اعلیٰ ترین طبقہ تک کے لوگ شریک ہوئے ہیں۔ جب آپ کے یہاں انتخابات میں صد فی صدی ووٹر اپنا ووٹ استعمال کرتے ہیں اور تمام کے تمام ووٹ کمیونسٹ نمائندوں کے حق میں دیئے جاتے ہیں تو آخر یہ مخالفین کہاں سے وجود میں آگئے۔ کیا انتخاب کے وقت انھیں ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں تھا یا مخالفت کے باوجود انھوں نے ووٹ آپ ہی کو دیا۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کے ملک میں اظہار رائے اور تنظیم کی مکمل آزادی ہے۔ پھر ان مخالفین نے ایسا کیوں نہیں کیا کہ ملکی پریس میں آپ کے خلاف آواز بلند کرتے، اپنی علیحدہ جماعت بنا کر کوشش کرتے کہ آئینی طور پر موجودہ حکومت کو ہٹا سکیں۔ یہ واقعات اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کہ کمیونسٹ ممالک میں پبلک کے اندر زبردست بے چینی کے اظہار کے تمام آئینی دروازے بند ہیں۔ اس لیے وہ غیر آئینی طریقوں سے ظہور کر رہی ہے۔ کمیونسٹ حکومتوں کا ایک طرف یہ اعلان کرنا کہ انھیں انتخابات میں سو فی صدی ووٹ ملتے ہیں اور دوسری طرف ہزاروں آدمیوں کو اس جرم میں قید کرنا کہ وہ موجودہ کمیونسٹ حکومت کا تختہ الٹنا

چاہتے تھے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ کمیونسٹ ممالک میں انسان کی آزادی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ آدمی اگر موجودہ حکمراں گروہ سے اختلاف کرنا چاہے تو اس کے لیے تمام آئینی اور جمہوری دروازے بند ہیں۔ اس کو اس بات کی آزادی تو ضرور ہے کہ جب انتخابات کا ڈراما ہو تو اس میں حکمراں طبقہ کے نمائندوں کو اپنا ووٹ دے دے لیکن اگر وہ ان سے اختلاف رکھتا ہے یا انہیں بدلنا چاہتا ہے تو کھلے پلیٹ فارم پر اپنی اس رائے کا اظہار نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے اسے سازشوں اور خفیہ کارروائیوں کا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔

روس کے نئے لیڈروں نے اعلان کیا ہے کہ اب کبھی روس میں اسٹالن کی تاریخ نہیں دہرائی جائے گی اور سوویت یونین خالص مارکسی لینینی طریقہ پر عمل کر کے اشتراکیت کی تعمیر جاری رکھے گا۔ مسٹر خروشچیف نے بیسویں کانگریس میں جو رپورٹ پیش کی تھی اس کے صاف معنیٰ یہ تھے کہ مارکسزم اپنے اس دعوے میں بری طرح ناکام ہو گیا ہے کہ مادی حالات کی تبدیلی سے انسانی سماج کی اصلاح ہو سکتی ہے مگر روسی لیڈروں نے یہ اعتراف اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرلیں بلکہ اس کا محرک در اصل یہ واقعہ تھا کہ اسٹالن کی حکومت سے روس کی پبلک بے حد عاجز آچکی تھی۔ اور آہنی گھیرے کے باوجود دنیا کے علم میں بھی یہ بات آچکی تھی کہ روس کے اندر آزادی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے، اس لئے اسٹالن کے وارثوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی رعایا کو اور ساری دنیا کو یہ باور کرائیں کہ ان کی حکومت اسٹالن کی حکومت سے مختلف ہوگی۔ اس کی دو صورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مارکسزم سے توبہ کر لیتے جو در اصل ان حالات کا واقعی سبب تھا اور اجتماعی ملکیت کا نظام ختم کر کے اپنے یہاں آزاد جمہوری نظام قائم کرتے۔ مگر وہ ایسا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا کہ ساری ذمہ داری ایک شخص کے اوپر ڈال دی — انھوں نے یہ ماننے سے انکار کیا کہ جو کچھ ہوا وہ اس طرز زندگی کا نتیجہ تھا جو روس میں عملاً رائج ہے کیوں کہ اس طرح خود ان کی غلطی بھی ثابت ہو رہی تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ اسٹالن کا ذاتی کردار تھا کہ اختیارات پا کر وہ روس کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ چنانچہ انھوں نے اجتماعی قیادت (Collective leadership) کا نعرہ لگایا۔ انھوں نے کہا کہ اب ہمارے ملک

میں ایک شخص کی ڈکٹیٹر شپ نہیں ہوگی بلکہ سب لوگ مل جل کر حکومت کریں گے۔اس طرح انھوں نے روس کے عوام اور روس کے محکوم ممالک کے باشندوں کو یہ یقین دلانا چاہا کہ جن نئے متولّیوں کے ہاتھ میں اب ان کی قسمت آئی ہے وہ پچھلی سخت گیر حکومت سے بالکل مختلف ثابت ہوں گے۔اب آمریت کے بجائے ان کے اوپر جمہوریت کی حکمرانی ہوگی۔شخصی قیادت کے بجائے اجتماعی قیادت ہوگی۔اسی طرح اپنی سلطنت سے باہر دنیا کی رائے عامہ کو انھوں نے یہ یقین دلانا چاہا کہ اسٹالن کے مرنے کے بعد اس کے ظلم و جبر کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے۔

مگر حالات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اجتماعی قیادت کا نعرہ محض فریب تھا۔اسٹالن نے اقتدار پانے کے بعد سازش اور قتل کے ذریعہ تمام ایسے لیڈروں کو میدان سے ہٹا دیا تھا جو کبھی اس کے حریف بن سکتے تھے۔اسٹالن کے بعد کریملن (Kremlin) کے اندر پھر وہی عمل شروع ہو گیا۔اس بار اس عمل کا ہیرو روسی کمیونسٹ پارٹی کا سکریٹری اول خروشچیف تھا۔پہلے مالنکوف کے ذریعہ بیریا کے گروہ کو ختم کر دیا گیا۔اس کے بعد روسی افواج کے مالک مارشل زوکوف کو ساتھ لے کر روس کے اعلیٰ ترین لیڈروں مالنکوف، مالوٹوف، شپیلفوف اور کگانوچ کو نکال باہر کیا گیا اور جب یہ کام پوری طرح انجام پا چکا تو خود زوکوف کو بھی ایک سازش کے بعد ٹھیک اس وقت برطرف کر دیا گیا جب کہ وہ ایک طویل سرکاری دورہ پر یوگوسلاویہ گئے ہوئے تھے۔۲۶ اکتوبر ۱۹۵۷ کو مارشل زوکوف کی دورہ سے واپسی اور ان کی علیٰحدگی کی خبر ماسکو ریڈیو سے ایک ساتھ نشر کی گئی۔اس طرح چند سال بھی نہیں گزرے تھے کہ ''اجتماعی قیادت'' کا نعرہ بکھر گیا اور اگر حالات میں مزید کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں ہوئی تو وہ دن دور نہیں جب کہ خروشچیف اسی طرح روس کا وحدہ لاشریک مالک ہوگا جس طرح اس سے پہلے اسٹالن رہ چکا ہے۔[۱]

روس کے حالیہ سائنسی مظاہرے جو زوکوف کی برطرفی کے فوراً بعد کیے گئے ہیں۔دراصل انھیں تاریک حالات پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہیں۔روس کے ان حالات نے پھر دنیا کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا

---

[۱] خروشچیف کے پارٹی سکریٹری کے ساتھ وزیر اعظم بن جانے کے بعد یہ پیشین گوئی پوری ہو چکی ہے۔

کہ جمہوریت اور اجتماعی قیادت کا نعرہ محض جھوٹا نعرہ ہے۔ اسٹالن اگرچہ مر گیا، لیکن روس میں جب تک مارکسی نظریۂ حیات کی حکمرانی ہے وہاں اسٹالن ازم زندہ رہے گا۔ ان حالات میں روسی لیڈروں نے یہ بہترین موقع سمجھا کہ ''مصنوعی چاند'' اڑا کر دنیا کی نگاہ کو حقیقی مسئلہ سے ہٹا کر اس کی طرف کر دیا جائے۔ ایک اخبار نے روس کے اس سائنسی مظاہرے پر بہت دلچسپ کارٹون شائع کیا تھا۔ اس نے دکھایا کہ خروشچیف نے فٹ بال کی مانند ایک گولے کو زور سے کک لگائی اور وہ فضاء میں پہنچ کر ناچنے لگا۔ یہ تصویر بنا کر اس نے فٹ بال پر لکھ دیا ''مارشل زوکوف''۔

کمیونزم کی ناگزیریت:

اکتوبر انقلاب کے بعد روس میں جو حالات پیش آئے۔ بعض مخلص اشتراکی اس کو ''انقلاب سے غداری'' کا نام دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انقلاب کی ناکامی اس کے اصولوں کی ناکامی نہیں تھی بلکہ یہ صرف اس بات کا نتیجہ تھی کہ بدقسمتی سے وہاں اسٹالن جیسا ایک شخص برسر اقتدار آ گیا۔ مشہور سوشلسٹ مسٹر جے پرکاش نرائن نے کہا:

''جدلیاتی مادیت انسانیت کی تکمیل کا ایک عقیدہ ہے جسے روس میں ایک ڈکٹیٹرانہ راجیہ کا مذہب بنا کر رکھ دیا گیا ہے[1]۔''

مگر یہ تاویل اپنی تردید آپ کر رہی ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ خود اشتراکی نظام کی یہ کمزوری تسلیم کر رہے ہیں کہ اس میں حکومت کے ہاتھ میں بے پناہ طاقت آ جاتی ہے۔ یہ تاویل دوسرے لفظوں میں خود اس امکان کو تسلیم کر رہی ہے کہ جدلیاتی نظام ایک ایسا نظام ہے جس کے سربراہ کار افراد اگر چاہیں تو نہایت آسانی سے اس کو ڈکٹیٹرانہ راجیہ کی شکل دے سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں آپ کے پاس وہ کون سا روک ہے جس کے ذریعہ آپ یہ توقع کرتے ہیں کہ ان سوشلسٹ حکمرانوں کو بگڑنے سے بچا سکیں گے جو تاریخ کے تمام شہنشاہوں سے زیادہ اختیارات کے حامل ہوں گے۔ اسی

---

[1] جمہوری سوشلزم، صفحہ ۱۳۔

پیچیدگی کا جواب دیتے ہوئے اشوک مہتا نے کہا ہے:

''سوشلزم کی اقتصادیات کا رجحان مرکوزیت کی طرف رہتا ہے اس لیے اس کی سیاست کا جمہوری اور غیر مرکوز ہونا اور سنسکرتی کا آزاد ہونا از بس ضروری ہے''۔[1]

مگر یہ جواب ایک موہوم تمنا سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ سوشلسٹ مفکرین جب سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید کرتے ہیں تو یہ ثابت کرنے میں پورا زور صرف کر دیتے ہیں کہ ذرائعِ معاش کا ایک گروہ کے ہاتھ میں آ جانا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ پوری سماجی زندگی اس گروہ کے ہاتھ میں چلی جائے اور سارا سماج اس کا غلام بن کر رہ جائے۔ مگر اپنے محبوب سوشلسٹ نظام میں ذرائع معاش کو حکمراں طبقہ کے ہاتھ میں دے کر امید رکھتے ہیں کہ پھر بھی آزادی اور جمہوریت باقی رہے گی۔ سوال یہ ہے کہ جب سوشلسٹ نظام میں ایک بار سیاست اور اقتصادیات کو مرکوز کر دیا جائے گا تو پھر کون سی طاقت ہوگی جو دوسری چیزوں کو آزاد رکھ سکے گی۔ اگر ملکیتی نظام میں نجی سرمایہ داروں کو کچھ مواقع حاصل ہوں تو وہ لٹیرے بن جاتے ہیں مگر سوشلسٹ نظام میں اس سے سینکڑوں گنا زیادہ اختیارات ایک محدود تر گروہ کے ہاتھ میں دینے کے بعد بھی یہ گمان کیا جاتا ہے کہ آزادی باقی رہے گی۔ سوشلسٹ مفکرین کا یہ بہت بڑا تضاد ہے کہ وہ ایک طرف اس تمدنی حل کو صحیح سمجھتے ہیں جو مارکس نے تجویز کیا ہے۔ دوسری طرف اس حل کے اولین تجربہ گاہ روس کی شدید مذمت کرتے ہیں کہ وہاں جبر و ظلم کا نظام قائم ہے۔ سوال یہ ہے کہ روس میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔ آخر جمہوری ممالک میں وہی کچھ کیوں نہیں ہونے لگتا۔ فرانس میں دس سال کے عرصہ میں ۲۵ حکومتیں بدل چکی ہیں مگر روس میں چالیس سال کے عرصہ میں ایک بھی حکومت نہیں بدلی۔ وہاں موت کے فرشتہ کے سوا اور کسی کو یہ طاقت حاصل نہیں ہے کہ حکمراں شخص کو اپنے سر سے ہٹا سکے۔ اس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اجتماعی ملکیت کے نظام میں کسی حکومت کو اتنے وسیع اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں جو کبھی کسی زمانہ میں کسی بدترین شہنشاہ کو بھی حاصل نہیں ہوئے تھے۔ پھر آپ جو حکومت بنانے والے ہیں وہ بھی اگر اقتدار پانے کے بعد اسی طرح

---

[1] جمہوری سوشلزم صفحہ ۲۲۳۔

بگڑ گئی جس طرح اسٹالن کی حکومت بگڑ گئی تو آپ کیا کریں گے۔

سوشلزم کو سیاسی جبر کے بغیر نافذ کرنے کا خیال ایک خطرناک خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ انسان کی اس کمزوری کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے اس کی تاویل کر کے ساری ذمہ داری حالات پر ڈال دینا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسٹالن نے جو کچھ کیا وہ اشتراکی نظام اور جدلیاتی اخلاق کا لازمی نتیجہ تھا۔ کوئی بھی دوسرا شخص جو اس کی جگہ ہوتا وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتا تھا جو اسٹالن نے کیا۔ مارکس کو اقتدار نہیں ملا مگر اس کی تحریروں میں، اس کا جو کردار نظر آتا ہے وہ اسٹالن کے کردار سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ مارکس نے خود کہا تھا کہ ''ہم جلاّد ہیں''۔ مئی ۱۹۴۹ میں جب جرمنی کی حکومت نے مارکس کو جلاوطن کر دیا اور اس کو مجبوراً اپنا اخبار جدید رائیں گزٹ بند کر کے فرانس جانا پڑا تو اخبار کے آخری نمبر ۱۹ ر مئی کی اشاعت میں اس نے لکھا:

> ہمیں ستانے کے بہانے ڈھونڈنے کے لیے حکومت کیوں جھوٹ اور افتراء کے پل باندھ رہی ہے، ہم انقلابی ہیں جب ہمارے دن پھریں گے تو ہم اپنے تشدد کے لیے بہانے نہیں تراشیں گے۔''[1]

اس طرح کی بہت سی تحریریں ہیں جن میں اشتراکیت کے پیغمبر کا اخلاق پڑھا جا سکتا ہے مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ظلم اشتراکیت کی عین فطرت ہے۔ اجتماعی ملکیت کا حل ایک بالکل غیر فطری حل ہے اور تاریخ کی تمام روایات کے بالکل خلاف ہے۔ اس کو نافذ کرنے اور نافذ رکھنے کے لیے تشدد ناگزیر ہے۔ اسٹالن نے جو کچھ کیا وہ کمیونزم کے لازمی نتائج تھے جن کی ابتدا پورے زور وشور کے ساتھ خود لینن کے زمانے میں ہو چکی تھی۔ ماسکو کا یہ اعلان کہ ''اسٹالن آج کے دور کا لینن ہے'' ایک معنیٰ میں اس کی تعریف ہے اور دوسرے معنیٰ میں اس واقعہ کا اظہار ہے کہ لینن اگر زندہ رہتا تو اس کی پالیسی بھی وہی ہوتی جو بعد کے زمانوں میں اسٹالن نے اختیار کی۔ لینن کو زیادہ تر محنت کش طبقہ کے ان ''دشمنوں'' سے جنگ کرنی پڑی جو ''سرمایہ دار'' تھے۔ اور اسٹالن کو ان دشمنوں سے

---

[1] شیر جنگ صفحہ ۷۷۔

بھی لڑنا پڑا جو خود پارٹی کے اندر پیدا ہو گئے۔ لینن کا زمانہ انقلاب کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ اس وقت اندرونی جھگڑے زیادہ نہیں ابھرے تھے اس لیے اس کا نشانہ زیادہ تر روس کا ''آخری سرمایہ دار'' اور ملک کی غیر بالشویک پارٹیاں تھیں۔ مگر اسٹالن کے زمانے میں خود پارٹی کے اندر لیڈرشپ حاصل کرنے کی جنگ شروع ہو چکی تھی جیسا کہ عموماً انقلاب کے بعد ہوتا ہے۔ اس لیے اسٹالن کو ''گھر کے غداروں'' سے بھی لڑنا پڑا۔ لینن نے زیادہ تر باہر کے لوگوں پر ہاتھ صاف کیے تھے۔ اسٹالن کو خود کمیونسٹ کے خون سے بھی ہولی کھیلنی پڑی۔ یہ جو کچھ ہوا اگر خود مارکس روس کا وزیر اعظم ہوتا اس کو بھی وہی کچھ کرنا پڑتا جو اسٹالن نے کیا۔ جہاں سماج کو دو متضاد طبقوں میں بانٹ دیا جائے وہاں دشمنی اور تشدد کا پیدا ہونا لازمی ہے اور جب دشمنی اور تشدد کے رجحانات ایک بار پیدا ہو گئے تو وہ کسی ایک حد پر نہیں رکتے۔ یہ سانپ صرف دوسروں کو نہیں ڈستا بلکہ خود اپنے بچوں کو نگل جاتا ہے۔ مشہور سوشلسٹ لیڈر اشوک مہتا نے بہت صحیح کہا ہے کہ:

''زار کو قتل کرنے کے بعد ناگزیر طور پر آپ ٹراٹسکی کو بھی قتل کر دیتے ہیں''۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ لینن کے روس میں وہ تمام عناصر اپنی ابتدائی حالت میں موجود تھے جو بعد کو اسٹالن کے روس میں نمایاں ہوئے۔ اگر لینن زندہ رہتا اور اس کو وہ عمر ملتی جو اسٹالن کو ملی تو یہ بات یقینی ہے کہ وہ حالات سے مجبور ہو کر ہر وہ اقدام کرتا جو اسٹالن نے اپنے دور اقتدار میں کیے ہیں۔ کمیونزم جب برسر اقتدار ہو تو وہ اسٹالن ازم ہی ہو گا، اس کے علاوہ کچھ اور ہونا ممکن نہیں ہے۔

اشتراکیت کا جھوٹ ظلم کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا

کمیونزم کا دعویٰ ہے کہ تاریخ میں پہلی بار اس نے انسانیت کے مسائل کا صحیح حل پیش کیا ہے اور کمیونسٹ ممالک روئے زمین کے وہ خوش قسمت علاقے ہیں جہاں عملاً یہ حل اپنے نتائج دکھا رہا ہے، جہاں انسان کو وہ سب کچھ حاصل ہو گیا جس کا وہ ابھی تک صرف خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک عظیم

---

[1] جمہوری سوشلزم صفحہ ۱۲۸

جھوٹ ہے جو صرف اس صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب کہ کمیونسٹ ممالک کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے تمام آزاد ذرائع ختم ہو جائیں اور صرف وہاں کی حکومتوں کے سرکاری بیانات ہی براہ راست علم حاصل کرنے کا تنہا ذریعہ ہوں ۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی ممالک اپنے جھوٹ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے نشر واشاعت کے تمام ذریعوں پر مکمل قبضہ کر لیتے ہیں اور شہری زندگی پر ایسی زبردست پابندیاں عائد کر دیتے ہیں کہ کسی شخص کے لیے ملک کے اندر رہتے ہوئے آزادانہ طور پر اظہار خیال کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اس اعتبار سے بھی اشتراکیت کا ظلم وتشدد کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شہری آزادی کو منسوخ کیے بغیر اشتراکیت کے دعویٰ کو ثابت ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا پرستانہ نظام کے سوا دنیا میں کوئی بھی ایسا نظام نہیں ہے جو صحیح معنوں میں انسانیت کو خوش حالی اور امن دے سکے ۔ انسانی ساخت کا کوئی نظام اگر اپنی کامیابی ثابت کرنا چاہتا ہے تو اس کی ایک ہی شکل ہے، وہ یہ کہ جس جگہ یہ نظام نافذ ہو اس کے گرد آہنی پردہ کھڑا کر دیا جائے تا کہ باہر سے کوئی شخص جھانک کر نہ دیکھ سکے کہ اندر کیا ہو رہا ہے اور اندرونی طور پر اس کی پالیسی یہ ہو کہ خیال وافکار کے پھیلنے کے تمام ذرائع کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور پھر فرضی طور پر دنیا کو یہ خبر سنائے کہ اس آہنی گھیرے کے اندر جنت بسی ہوئی ہے۔ اندر سے گولیوں کی آواز سنائی دے تو وہ کہے کہ غداروں کو ان کے انجام تک پہنچایا جا رہا ہے۔ کوئی شخص جیل کی دیوار پھاند کر بھاگ نکلے اور اندر کی داستان سے دنیا والوں کو خبر دار کرنا چاہے تو وہ جواب دے کہ یہ دشمن کا ایجنٹ ہے جو ہمارے بارے میں غلط پروپیگنڈا کرتا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ کمیونزم نے اپنی سیاسی تشکیل کے لیے ''ڈکٹیٹرشپ'' کو پسند کیا۔ اس کے سوا کوئی اور سیاسی ڈھانچہ اس کے مطلب کے لیے مفید ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا دعویٰ اس کے بغیر ثابت ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کو اپنے علاقہ میں مکمل اقتدار حاصل ہو۔ جہاں حکومت کی زبان کے سوا تمام زبانیں بند کر دی گئی ہوں، جہاں تمام ذرائع و وسائل پورے طور پر اس کے قبضہ میں ہوں ۔ وہ جس کو چاہے گرفتار کر لے، جس کو چاہے جلاوطن کر دے، جس کو چاہے گولی مار دے، جہاں پبلک کا کوئی پریس بھی نہ ہو جو اصل صورت حال سے دنیا کو

باخبر کر سکے۔ ''سرخ جنت'' کی ساری اہمیت اسی وقت تک ہے جب تک اس کے گرد آہنی پردہ پڑا رہے۔اس پردے کے بغیر سرخ جنت کبھی قائم نہیں کی جاسکتی۔

یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے ''ڈکٹیٹرشپ'' کے تصورات کو الگ کر کے جمہوری طرز پر سوشلزم قائم کرنا چاہا، انھیں اس سلسلہ میں سخت ناکامی ہوئی۔جاپان میں ۱۹۴۵ کے انتخابات میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے ٹکٹ پر ایک سوممبر کامیاب ہوئے تھے۔اس کے بعد جب ۱۹۴۷ میں دوسرا الیکشن ہوا تو پارٹی کے کامیاب ممبروں کی تعداد ۱۴۶ ہوگئی ۔ اس وقت سوشل ڈیموکریٹک پارٹی پارلیمنٹ کی سب سے بڑی پارٹی تھی ۔اس نے مخلوط وزارت بنانے کا فیصلہ کیا اور غیر سوشلسٹ عناصر کے ساتھ مل کر جاپان میں اپنی حکومت قائم کی۔اس کا نتیجہ بظاہر یہ ہونا چاہئے تھا کہ جاپان کی پبلک سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ جمہوری سوشلزم کی برکتوں کو دیکھ کر بالکل اس پر فدا ہو جاتی اور اگلے الیکشن میں وہاں کی سوشلزم پارٹی کو سو فی صدی ووٹ ملتے۔مگر ہوا کیا؟ دو برس کے بعد ۱۹۴۹ میں جب جاپان کے عام انتخابات ہوئے تو سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبران کی تعداد پارلیامنٹ میں ۱۴۶ سے گھٹ کر صرف ۴۸ رہ گئی۔[1]

ہندستان میں بھی اسی قسم کا ایک تماشا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں ۔ ۱۹۵۳ کے آخر میں ٹراونکور کوچین (موجودہ کیرالا) میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کی وزارت قائم ہوئی۔تھوڑے دنوں بعد وہاں کی حکومت کے بعض اعمال کی وجہ سے پبلک میں شورش پیدا ہوگئی۔ یہاں تک کہ عوام اور حکومت میں تصادم کی نوبت آگئی۔ ۱۱اگست ۱۹۵۴ کو پولیس فائرنگ ہوئی ۔جس میں ایک درجن آدمی زخمی ہوئے اور آٹھ آدمی ہلاک ہوگئے ۔ یہ فائرنگ کسی اشتراکی اسٹیٹ میں نہیں ہوئی تھی کہ دنیا کو اس کی آواز ہی سنائی نہ دیتی۔فوراً اس کی خبر سارے ملک میں پھیل گئی اور پرجا سوشلسٹ حکومت پر سخت اعتراضات ہونے لگے۔خود پارٹی کے اندر سخت انتشار پیدا ہوگیا۔بالآخر اس وزارت کا انجام یہ ہوا کہ اسمبلی میں خود پارٹی کے ایک ممبر نے اس کے خلاف عدم اعتماد کا رزولیوشن پیش کیا جو کثرت رائے سے

---

[1] اشوک دور میں جمہوری سوشلزم، صفحہ ۹۱

پاس ہوگیا اور پھر دس مہینے کام کرنے کے بعد یہ وزارت ختم ہوگئی۔

اب اسی علاقہ میں ہندستانی کمیونسٹ پارٹی نے اپنی وزارت بنائی ہے۔ یہ دنیا کی پہلی کمیونسٹ حکومت ہے جو کسی آزاد جمہوری علاقہ میں بالکل آئینی اور جمہوری طرز پر قائم کی گئی ہے اور جہاں تک میں نے حالات کا اندازہ لگایا ہے، میرا خیال ہے کمیونسٹ پارٹی کے حق میں بھی وہی بات ثابت ہوگی جو اس سے پہلے جاپان اور خود اس ملک کی سوشلسٹ پارٹیوں کے حق میں صحیح ثابت ہوچکی ہے۔

معاشی خوشحالی کی حقیقت

بعض لوگ اس قسم کی دلیل دیتے ہیں کہ ''سیاسی طور پر سوویت روس میں ڈکٹیٹر شپ سہی اور یہ بھی درست کہ اس نے شخصی آزادی پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے بھوک کے بنیادی مسئلہ کو حل کر لیا ہے''۔ یہ کہنا دوسرے لفظوں میں اس بات کا دعویٰ کرنا ہے کہ ظلم اور انصاف، دینا اور چھیننا دونوں حالتیں بیک وقت ایک جگہ جمع ہوسکتی ہیں۔ تاہم اگر کمیونزم کا کمال یہی ہے تو یہ سوویت روس یا دوسرے کمیونسٹ ممالک کی خصوصیت نہیں۔ دنیا کے تمام جیل خانوں میں یہ چیز بہت پہلے سے موجود ہے۔ جیل کا قانون اگرچہ انسان کی آزادی پر پابندی عائد کرتا ہے اور اس کے اوپر ظلم کو جائز قرار دیتا ہے۔ مگر بھوک کے بنیادی مسئلہ کو اس نے بھی حل کر دیا ہے اور ماضی کے تاریک دور میں غلام سماج کے اندر غلاموں اور جاگیرداری سماج کے اندر کمیروں (sekfs) کو بھی یہ چیزیں حاصل تھیں جن سے ان کی آزادی چھین لی گئی تھی مگر ان کے آقاؤں نے ''بھوک کے بنیادی مسئلہ'' کو ان کے لیے حل کر دیا تھا۔

تاہم اس سے قطع نظر جو لوگ روس کی معاشی خوش حالی کا قصیدہ پڑھتے ہیں، میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ خبر آپ کو ملی کہاں سے؟ کیا روسی اخبارات اور وہاں سے شائع ہونے والی کتابوں کے ذریعہ، مگر یہ تمام اخبارات اور کتابیں خود حکومت کی طرف سے شائع ہوتی ہیں۔ پھر ان کا کیا اعتبار۔ یہ تو خود فریق کا اپنا بیان ہے، نہ کہ کسی غیر جانب دار شخص کا۔ پھر جس طرح روس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کے باشندے معاشی اعتبار سے بہت خوشحال ہیں، ٹھیک اسی طرح وہ اس بات کو بھی نہایت

زور وشور کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ ''روس میں مکمل آزادی ہے''۔ بلکہ اس کا تو دعویٰ ہے کہ روس کے بیس کروڑ عوام تاریخ میں وہ پہلے عوام ہیں جو حقیقی معنوں میں آزاد ہوئے ہیں۔ پھر کس بنیاد پر آپ ایک ہی شخص کے دعویٰ کو ایک معاملہ میں صحیح تسلیم کرتے ہیں اور دوسرے معاملے میں اس کو جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ اور اگر روس کی فراہم کردہ معلومات پر آپ کے دعویٰ کی بنیاد نہیں ہے تو کیا زائرین روس کے بیانات اس کا ماخذ ہیں مگر زائرین روس[1] کے بیانات میں زبردست تضاد ہے۔ کمیونسٹ نواز سیاح اگر یہ کہتے ہیں کہ وہاں معاشی جنت بسی ہوئی ہے تو اس کے مخالفین کا بیان اس کے بالکل برعکس ہے۔ پھر آپ کسے تسلیم کریں گے۔ کیا آپ نے روس جا کر وہاں کے باشندوں سے براہ راست معلومات حاصل کی ہیں۔ لیکن جب آپ خود وہاں سیاسی جبر کو تسلیم کرتے ہیں تو آپ کیسے یقین کرتے ہیں کہ وہاں کا کوئی باشندہ آپ سے ایسی باتیں کہے گا جو حکومت کے اعلان کردہ پالیسی کے خلاف ہو۔ کمیونسٹ ملکوں میں زبان کی آزادی نہیں ہے، اس لیے وہاں کی ہر اطلاع سرکاری اطلاع ہوتی ہے۔ روس میں جو لوگ سیاحت کی غرض سے جاتے ہیں، وہ جب سرکاری انتظام کے تحت حکومت کے ترجمان کے ذریعہ وہاں کے کسی باشندہ سے گفتگو کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ اپنے ملک کی تعریف میں قصیدے سناتا ہے۔ مگر دوسری طرف صرف کمیونسٹ ممالک ہی دنیا میں ایسے ملک ہیں جہاں سے ہزاروں لاکھوں باشندے بھاگ بھاگ کر مستقل طور پر باہر کے ملکوں میں پناہ لے رہے ہیں اور اپنے ملک کے بارے میں ایسے ہولناک واقعات کا انکشاف کرتے ہیں جس کا تصور بھی آدمی کو لرزانے

---

[1] یہاں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو اس وقت پیش آیا جب ہندستان کے دوسرے عام الیکشن سے پہلے کمیونسٹ پارٹی ملک کی بدحالی اور حکومت کی نالائقی کا حوالہ دے کر اپنے لیے ووٹ مانگ رہی تھی۔ جنوری ۱۹۵۷ میں کلکتہ کی ایک پریس کانفرنس میں کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری مسٹر اجے گھوش سے پوچھا گیا ''کیا چین کے وزیر اعظم مسٹر چو این لائی کی ان تقریروں سے آئندہ انتخابات پر کوئی اثر پڑے گا جس میں انھوں نے موجودہ حکومت کی تعریف کی ہے اور ملک کی ترقیوں کا اعتراف کیا ہے''، تو انھوں نے جواب دیا کہ ''ہم ملک کا حال زیادہ جانتے ہیں نہ کہ ایک غیر ملکی جو ہمارے ملک میں صرف چند دن کے لیے آئے'' ـــــــ غیر ملکی سیاح اگر ہندستان کو ترقی یافتہ کہیں تو اس سے ہندستان کی ترقی ثابت نہیں ہوتی مگر اسی قسم کے کچھ لوگ روس کا قصیدہ پڑھیں تو اس سے وہاں کی ترقی ثابت ہو جاتی ہے۔ یہ ہے کمیونسٹ منطق۔

کے لیے کافی ہے۔ ایسی حالت میں کون سی بات مانی جائے اور کون سی بات نہ مانی جائے۔ مہاتما گاندھی نے صحیح کہا تھا کہ جس ملک میں لوگ شخصی آزادی اور تحریر وتقریر کی آزادی سے محروم ہوں وہاں یہ پتہ چلانا ناممکن ہو جاتا ہے کہ لوگ فاقہ سے نہیں مر رہے ہیں۔ اس موقع پر میں ان مغالطہ آمیز معلومات کا تجزیہ نہیں کروں گا جو روس کی ترقی ثابت کرنے کے لیے عموماً پیش کی جاتی ہے۔ میں اس سے بحث نہیں کروں گا کہ روس پر کتابیں لکھنے والے بیشتر مصنف اس کی مشینوں، فیکٹریوں، گندھک کے تیزاب اور ٹریکٹروں کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ انھیں ذکر کپڑے، مکان، اناج اور مکھن کا کرنا چاہئے۔ وہ ان دونوں قسم کی چیزوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کی نوعیت جداگانہ ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ان میں سے ایک کی موجودگی لازمی طور پر دوسری نوع کی چیزوں کی فراوانی کا سبب بنے۔ میں اس کا ذکر بھی نہیں کروں گا کہ اشتراکی ملکوں میں ترقیاتی منصوبوں کی قبل از وقت کامیابی کی داستان کس طرح محض دھوکا ہے۔ کیوں کہ پرجا سوشلسٹ لیڈر اچاریہ کرپلانی کے بقول ''منصوبوں کی کامیابی کا دارومدار تو اچھے سکریٹریوں پر ہوتا ہے جو اعداد وشمار کے گورکھ دھندے کی مدد سے منصوبہ کو کامیاب بنا دیتے ہیں''۔ میں اس کا بھی ذکر نہیں کروں گا کہ روس میں اجرتوں کی بڑی بڑی شرحیں جن کا اعلان بڑے زور وشور سے ہوتا رہتا ہے، اس وقت کتنی بے معنیٰ ہو جاتی ہیں جب ان کا مقابلہ وہاں ضروریات زندگی کی بے انتہا بڑھی ہوئی قیمتوں سے لگایا جائے۔ میں اس کا بھی ذکر نہیں کروں گا کہ اشتراکی ملکوں میں وزراء اور بڑے عہدیداروں کے بارے میں بہت کم تنخواہ لینے کا پروپیگنڈا اس وقت سرتاپا جھوٹ معلوم ہوتا ہے، جب اس حقیقت پر نظر ڈالی جائے کہ تنخواہ کے نام پر تو ضرور بعض اوقات وہ ایک معمولی رقم لیتے ہیں مگر قیمتی الاؤنس اور خوراک اور رہائش وغیرہ کے مفت انتظام کے ذریعہ وہ سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو کسی بورژوا ملک کے وزراء اور عہدیداران کو دیا جاتا ہے۔ میں اس کا بھی ذکر نہیں کروں گا کہ محض چند تقریروں اور مضامین کے ذریعہ کسی طرح کسی ملک کے واقعی حالات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کی تحریریں تو ہر ملک کے بارے میں فراہم کی جا سکتی ہیں۔ میں اس سے بھی بحث نہیں کروں گا کہ اشتراکی ملکوں

میں عام پبلک کی خوش حالی کی داستان ہمیشہ اوسط اعداد وشمار کی شکل میں پیش کی جاتی ہے، حالانکہ اوسط اعداد وشمار سے عام پبلک کی خوش حالی ثابت کرنا ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

بنیادی اصول:

یہ تمام بحثیں دراصل بعد کی بحثیں ہیں۔سوال یہ ہے کہ معاشی بہتری اور خوشحالی کے بارے میں ان دعووں کی نظریاتی توجیہہ کیا ہے۔روس یا دوسرے اشتراکی مما لک یہ دعویٰ کیوں کرتے ہیں کہ جو مسئلہ دوسرے ملکوں میں حل نہ ہو سکا وہ ان کے یہاں حل ہو گیا ہے۔اشتراکی ملکوں کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو انہیں سرمایہ دار مما لک سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ خصوصیت اجتماعی ملکیت کا نظام ہے۔ کمیونسٹ حضرات کا یہ دعویٰ ہے کہ اشتراکی ملکوں میں اور خاص طور پر روس میں انھوں نے سوشلزم کو قائم کرلیا ہے۔اور خوشحالی کے جو افسانے نشر کیے جاتے ہیں وہ سب دراصل اسی کے نتائج یا اسی دعوے کی دلیلیں ہیں۔ہم یہاں اسی اصل دعویٰ کی بابت گفتگو کریں گے۔

یہ صورت حال جو ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ غریب اور کچھ لوگ امیر بنے ہوئے ہیں، اس کی وجہ کیا ہے۔ مارکسزم کے نزدیک اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسانی محنت کی پیداوار جو خود محنت کرنے والے کو ملنی چاہئے، وہ دوسروں کو مل جاتی ہے۔دوسرے لفظوں میں، افلاس کا سبب یہ ہے کہ آدمی جتنا کماتا ہے وہ پورا اسے نہیں ملتا۔اور امارت کا سبب یہ ہے کہ آدمی کی کمائی کے اس بقیہ حصہ کو کچھ لوگ مفت میں ہڑپ کر لیتے ہیں۔مثلاً بہت سے لوگ کارخانہ اور زراعتی فارم قائم کرتے ہیں اور ان سے بڑے بڑے نفع حاصل کرتے ہیں۔ یہ نفع دراصل ان مزدوروں کی مزدوری کاٹ کر حاصل کیا جاتا ہے جو ان میں کام کرتے ہیں۔ مارکس کے الفاظ میں ''مزدوروں کی مزدوری جو غصب کی جاتی ہے وہی نفع کہلاتی ہے''۔ مارکس کے اسی نظریہ کو ''قدر زائد'' کا نظریہ کہا جاتا ہے۔جس کے ذریعہ وہ اس بات کی تشریح کرتا ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج میں ایک طرف افلاس اور دوسری طرف دولت کی فراوانی کیوں کر پیدا ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی تیار شدہ چیز جو ایک مخصوص قیمت پر بازار میں بکنے آتی ہے، اس کی قیمت کا انحصار صرف دو قسم کی چیزوں پر ہے۔اولاً کچّا مال اور مشین وآلات وغیرہ اور دوسرے

محنت کی قوت پیداوار جس کا بلحاظ وقت تعین ہوتا ہے۔اس تصور کے مطابق، کسی چیز میں جو قیمت پیدا ہوتی ہے۔اس کا سبب قدرتی اشیاء کے بعد وہ انسانی محنت ہے جو اس کے بنانے پر صرف ہوتی ہے۔ اس لیے کسی چیز کی تیاری اور تنظیم میں سرمایہ دار کا ذہن جو کچھ کام کرتا ہے اور اس کو قابل منفعت بنانے کے لیے وہ کارخانہ سے باہر جو کوشش انجام دیتا ہے، مارکس کے نزدیک وہ ''محنت'' میں شامل نہیں ہے۔محنت صرف وہ چیز ہے جس کو مزدور خرچ کرتا ہے۔اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ کسی تیار شدہ چیز کی فروخت سے جو قیمت حاصل ہو، اصولی اعتبار سے اس کو صرف مزدور اور اس میں لگی ہوئی قدرتی اشیاء کی طرف لوٹنا چاہئے۔سرمایہ دار کا اس میں کچھ حصہ نہیں ہونا چاہئے۔مثلاً کپڑے کی ایک گانٹھ ساڑھے چارسو میں فروخت ہوتی ہے۔فرض کیجئے کہ اس میں کچا مال، ایندھن، مشینری، عمارت کا کرایہ وغیرہ کی صورت میں دوسو روپئے لگے ہیں اور دوسو روپئے مزدوروں کو اجرت کے طور پر دیئے گئے ہیں۔اس طرح اس کی لاگت چارسو روپئے ہوئی۔مگر اس کو ساڑھے چارسو روپے میں بیچ کر جو مزید پچاس روپئے حاصل کیے گئے وہ کہاں سے آئے؟ مارکس کہتا ہے کہ یہ روپیہ بھی مزدوروں ہی کا حصہ تھا مگر سرمایہ دار نے ان کی اجرت میں کمی کر کے پچاس روپئے بچا لیے اور منافع کے نام سے اس پر خود قبضہ کر لیا۔یہی وہ ''قدرزائد'' ہے جس کی وجہ سے سرمایہ دار طبقہ کے پاس سرمایہ کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔سرمایہ دار کو لوٹ کا یہ موقع ملکیتی نظام میں ملتا ہے جس میں پیداوار کے ذرائع افراد کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔اس لیے مارکس کی تشخیص ہے کہ ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے۔یعنی جو پیداوار تیار کرے وہی اس کا مالک بھی ہو تاکہ پورا منافع اسی کو ملے، نہ کہ کسی دوسرے کو۔نظریہ قدرزائد کے مطابق، سرمایہ دار کارخانہ سے جو منافع لیتا ہے وہ ''قانونی ڈاکہ زنی'' ہے۔فرسٹ انٹرنیشنل کا تیسرا اجلاس ستمبر ۱۸۶۸ میں بروسلز میں ہوا۔اس میں ایک قرارداد ''مزدور کی پیداوار مزدور کے لیے'' پاس ہوئی تھی جو حسب ذیل ہے:

''ہر وہ سماج جو کہ جمہوری اصولوں پر قائم ہو، سرمایہ کے ہر تصرف کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ چاہے وہ تصرف کرائے کی شکل میں ہو، سود کی شکل میں ہو، منافع کی شکل میں ہو، چاہے

کسی اور شکل میں ہو۔محنت کو اس کی پوری اجرت ملنی چاہیئے اور اس کے پورے حقوق اس کے قبضہ میں ہونے چاہئیں۔''

اس بات کو ایک اور پہلو سے دیکھیئے۔ مارکس نے انسانی سماج کے ارتقاء کا جو نظریہ پیش کیا ہے۔اس کے مطابق، وہ موجودہ حالت میں مستقبل تک اس کے تین دور قرار دیتا ہے۔سرمایہ دارانہ سماج، سوشلسٹ سماج، اور کمیونسٹ سماج۔سرمایہ دارانہ سماج وہ ہے جو اس وقت موجود ہے اور جو مارکس کے نزدیک بدترین سماج ہے۔کمیونسٹ سماج اس کا وہ آئیڈیل ہے جہاں وہ انسانیت کو لے جانا چاہتا ہے اور سوشلسٹ سماج سرمایہ داری سے کمیونزم کی طرف سفر ارتقاء کا عبوری دور ہے۔ مارکس کے نزدیک یہ تینوں قسم کے سماج معاشی اسباب کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی کو زندہ رہنے کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چیزیں کوئی ایک شخص تیار نہیں کرسکتا۔اس لیے بہت سے لوگ مل کر انھیں بناتے ہیں۔کوئی شخص ایک کام کرتا ہے کوئی دوسرا، اور کوئی تیسرا، اور پھر اپنی پیداوار کا ایک حصہ دوسروں کو دے کر ان سے وہ چیزیں حاصل کر لیتے ہیں جو وہ خود نہیں بنا سکتے۔اسی باہمی لین دین سے وہ اجتماعی زندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم سماج کہتے ہیں۔مارکسی نقطۂ نظر کے مطابق، سماج اس کے سوا کسی چیز کا نام نہیں کہ وہ باہمی لین دین کی اجتماعی صورت ہے۔

مارکسی نقطۂ نظر کے مطابق، کسی سماج کے بارے میں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ ترقی کے کس مرتبہ پر ہے، یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہاں لین دین کس طرح ہوتا ہے۔یہ لین دین یا تو چیزوں کی قدر تبادلہ (Exchang Value) کے مطابق ہوگا یا قدر اصل (Intrinsic Value) کے مطابق یا قدر استعمال (Use Value) کے مطابق۔قدر استعمال کسی چیز کی اس خصوصیت کو کہتے ہیں کہ وہ انسان کی ایک ضرورت پوری کرتی ہے۔قدر اصل اس کی وہ واقعی قیمت ہے جو انسانی محنت کی بنا پر اس کے اندر پیدا ہوتی ہے اور قدر تبادلہ اس کی وہ قیمت ہے جو رسد اور طلب کی کشمکش سے متعین ہوتی ہے اور کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتی رہتی ہے۔جس سماج میں اجناس کا تبادلہ استعمال کے نقطۂ نظر سے ہو، وہ سماج

کیمونسٹ سماج کہلائے گا۔ جس سماج میں اجناس کا تبادلہ قدر اصل کے نقطۂ نظر سے ہو وہ سماج سوشلسٹ سماج کہا جائے گا اور جہاں اجناس کا لین دین قدر تبادلہ کے نقطۂ نظر سے ہو، وہ سماج سرمایہ دار سماج کہا جائے گا، جیسا کہ ہمارا موجودہ سماج ہے۔ سماج کی ان تینوں قسموں کی تشریح دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ جس سماج میں چیزوں کا لین دین نفع کی غرض سے ہو، وہ سرمایہ دارانہ سماج ہے۔ جس میں کوئی کسی سے نفع کا طالب نہ ہو، اور ہر شخص کو اس کی محنت کے بقدر پورا معاوضہ مل جائے وہ سوشلسٹ سماج ہے اور جہاں آدمی ان دونوں قیدوں سے بے نیاز ہو جائے، جہاں نہ تو ایسا ہو کہ آدمی ایک دوسرے سے نفع حاصل کرنا چاہے، نہ یہی ضروری ہو کہ کام کیے بغیر آدمی کو کچھ نہیں مل سکتا بلکہ ہر شخص کو کسی رکاوٹ کے بغیر اس کی ضروریات حسب خواہش اسی طرح مل جائیں جیسے آب و ہوا اور پانی مل رہے ہیں، وہ کمیونسٹ سماج ہے۔ جو مارکس کے عقیدے کے مطابق، انسانی سماج کے ارتقاء کی بلند ترین منزل ہے۔ یہ ایسا سماجی نظام ہے جس میں اجناس کی صرف قدر استعمال دیکھی جائے گی اور اسی نقطۂ نظر سے افراد مختلف جنسوں کا تبادلہ کریں گے۔ یعنی آپس میں تبادلہ کرتے وقت یہ نہ دیکھا جائے گا کہ کس نے کتنی محنت خرچ کی ہے اور اس کا اسے کتنا معاوضہ ملنا چاہئے۔ تمام تبادلے صرف ضرورت کے پیش نظر ہوں گے نہ کہ نفع طلبی یا معاوضہ خدمت کے طور پر۔

''اگر کسی سماج میں جنس کی قدر استعمال ہی دیکھی جانے لگے تو وہاں جنس کی قدر اصل اور نسبت تبادلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس سماج میں انسان دو بچوں کی طرح تبادلہ کریں گے جن میں سے ایک کے پاس نارنگی ہے اور دوسرے کے پاس گڈولنا[1] ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی چیز لینا چاہتے ہیں تو یہ آپس میں تبادلہ کرلیں گے۔ یہاں دونوں بچوں کے سامنے نارنگی اور گڈولنے کی قدر استعمال ہے۔ اگر بچوں کا نقطۂ نظر قدر اصل اور نسبت تبادلہ ہوتا تو جس بچے کے پاس گڈولنا تھا وہ یہ مطالبہ کرتا کہ چار درجن نارنگیاں لاؤ تب گڈولنا دوں گا۔ جس سماج میں جنس کو قدر استعمال ہی کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جانے لگے

---

[1] گڈولنا بچوں کی گاڑی کو کہتے ہیں۔

اس سماج میں جنس کا تبادلہ اسی طرح ہوگا جیسا کہ ان بچوں نے کرلیا۔ ان بچوں اور کمیونسٹ سماج کے اجناس کے تبادلہ میں صرف یہ فرق ہوگا کہ بچوں نے یہ تبادلہ غیر شعوری طور پر کیا۔ لیکن کمیونسٹ سماج میں ایک خاص اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی ماحول میں یہ تبادلہ شعوری طور پر ہوگا۔''

جہاں تک مارکسزم کی آخری منزل یعنی کمیونسٹ سماج کا تعلق ہے، اشتراکی حضرات کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ انھوں نے اس آخری منزل تک رسائی حاصل کرلی ہے، نہ بقید ہوش وحواس کوئی کمیونسٹ اس کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ فی الحال ان کا دعویٰ صرف یہ ہے کہ انھوں نے انسانی سماج کو سوشلزم تک پہنچا دیا ہے۔ یعنی موجودہ اشتراکی ملکوں میں ہر شخص کو اس کی ضرورت کے بقدر اشیاء تو فراہم نہیں کی جاسکی ہیں مگر انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ختم ہوگیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سرمایہ دار ممالک کے مقابلہ میں اشتراکی ملکوں کی خوشحالی کا سبب یہ ہے کہ ایک جگہ آدمی کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ نہیں ملتا اور دوسری جگہ آدمی کو اس کی پوری کمائی مل جاتی ہے۔ سرمایہ دار ممالک میں آدمی محنت کرکے جو کچھ کماتا ہے اس میں سے ایک حصہ سرمایہ دار اچک لے جاتا ہے۔ اس طرح خود محنت کرنے والے کے پاس اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تھوڑی رقم رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس سوشلسٹ ممالک میں یہ اچکنے کا عمل ختم ہوگیا ہے اور آدمی کو اس کی محنت کی پوری کمائی دے دی جاتی ہے۔ اس اصول کے مطابق، ہم کو ایک ایسی واضح بنیاد مل جاتی ہے جس کی روشنی میں جانچ کر ہم یہ دیکھ سکیں کہ کمیونسٹ ممالک میں فی الواقع خوش حالی آئی یا نہیں۔ اشتراکی ملکوں میں جو کچھ ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کی ملکیت افراد کے بجائے حکومت کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔ مگر انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ختم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زمین اور کارخانے کے نجی مالکوں کو برطرف کرکے ان کو ''سماجی ملکیت'' کے ٹھیکہ داروں کے قبضہ میں دے دیا جائے، بلکہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مارکسی تشریح کے مطابق، ہر شخص اپنی محنت کے بقدر پورا معاوضہ پانے لگے اور اس کی محنت کے حاصل میں کوئی دوسرا شخص شریک نہ ہو، جیسا کہ اوپر بتایا گیا۔ مارکسی نظریہ کے مطابق، کسی پیداواری نظام میں جو منافع ہوتا

ہے وہ تمام تر ان لوگوں کی محنت کا نتیجہ ہے جو اس کو تیار کرتے ہیں، یعنی مزدور۔ اس لیے پیداوار کا سارا منافع مزدوروں کو ملنا چاہئے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی چیز کی تیاری میں جو ہاتھ کام کرتے ہیں وہی اس میں قیمت پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے وہی لوگ اس کے پورے فائدے کے مستحق ہیں۔ منافع کی ایسی تقسیم جس میں ایسے لوگوں کو بھی شریک کیا جائے جو اس کی تیاری میں براہ راست حصہ نہیں لیتے اور دور بیٹھ کر محض اس کی رہنمائی کرتے ہیں گویا ایک طرح کی لوٹ ہے جس کو قانون نے جائز کر دیا ہے۔ کارخانہ کا مالک جو محض اپنے سرمایہ اور انتظام کی وجہ سے اس کے منافع میں حصہ دار بن جاتا ہے، وہ حصہ دار نہیں بلکہ ایک ڈاکو ہے جو مزدوروں کی محنت کی کمائی غصب کر رہا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق، سوشلسٹ سماج کے معنیٰ یہ ہوئے کہ وہاں زمین اور کارخانہ کی تمام پیداوار صرف ان لوگوں کی ملکیت ہونی چاہیئے جو "محنت" کر کے اسے پیدا کرتے ہیں۔ اس کا سارا منافع انہی کو دینا چاہئے اور اس میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہونا چاہئے۔ مگر کیا ایسا ممکن ہے اور کیا کسی اشتراکی ملک میں اس پر عمل کیا جا رہا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ کوئی کارخانہ محض مزدوروں کے ذریعہ نہیں چلایا جا سکتا بلکہ اس کے لیے منتظمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملکیتی نظام میں یہ خدمت نجی مالک یا اشتراکی اصطلاح میں سرمایہ دار طبقہ انجام دیتا ہے اور اشتراکی نظام میں یہ خدمت براہ راست حکومت انجام دے گی۔ پھر حکومت کے اخراجات اور انتظامی عہدیداروں کی تنخواہ کہاں سے دی جائے گی۔ اگر کارخانہ کی آمدنی سے اسے حاصل کیا جائے تو کیا اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ وہی سابق لوٹ نئی شکل میں واپس آ گئی ہے۔ سرمایہ دار مزدوروں کی اجرت میں کمی کر کے ایک رقم بچا لیتا تھا اور منافع کے نام سے اس پر قبضہ کر لیتا تھا۔ آپ بھی اسی طرح کارخانہ کی آمدنی سے ایک رقم بچا کر حکومت کی طرف منتقل کر دیتے ہیں تاکہ اس کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ پھر دونوں میں فرق کیا ہوا۔ کیا یہ ایک لوٹ کو مٹا کر دوسری لوٹ کو قائم کرنا نہیں ہے۔ کیا اس لوٹ کو باقی رکھتے ہوئے خوش حالی کا وجود ممکن ہے۔

اشتراکی ملکوں میں یہ نئی قسم کی لوٹ پورے زور شور کے ساتھ جاری ہے۔ میں ژیرزنسک کارخانہ کی مثال دیتا ہوں جو سوویت یونین کی کپڑے کی صنعت کے مرکزی شہر اوانووو (Ivanovo)

میں واقع ہے اور ملک میں سوت کاتنے کا سب سے بڑا کارخانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کارخانہ میں ۱۹۵٦ کے اعداد وشمار کے مطابق، مزدوروں کی اجرت اور دیگر اخراجات ادا کرنے کے بعد منافع کے طور پر جو رقم حاصل کی گئی ہے وہ چار کروڑ روبل ہے۔ اس میں سے کچھ رقم ڈائرکٹر فنڈ وغیرہ میں دی گئی اور تین کروڑ ساٹھ لاکھ روبل حکومت کے خزانہ میں منتقل کر دئے گئے، یعنی منافع کا ۹۰ فیصدی [1] کیا یہ ٹھیک وہی سرمایہ دارانہ نظام کا ''قدر زائد'' نہیں ہے جو اشتراکی ملک میں نئے قسم کے سرمایہ دار وصول کرر ہے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے لیے اشتراکی حضرات کا فتویٰ ہے کہ ''مزدور کی جو مزدوری غصب کی جاتی ہے وہی نفع کہلاتی ہے''۔ پھر نام نہاد اشتراکی نظام میں مزدور کی پیداوار سے جو منافع حاصل کیا جاتا ہے وہ بھی آخر مزدوروں کی غصب کی ہوئی اُجرت کیوں نہیں ہے؟ سوویت روس کے مرکزی بجٹ کی آمدنی کا پچاسی فیصدی حصہ ریاستی کارخانوں اور معاشی تنظیموں سے آتا ہے۔ ۱۹۵۷ کے بجٹ میں منافع کی یہ رقم ایک کھرب، چھپن ارب نوّے کروڑ روبل بتائی گئی ہے۔ میں حکومتوں کے لیے اس طرح کی آمدنی کو معاشی اعتبار سے عین درست سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی نظام چلایا ہی نہیں جاسکتا۔ مگر ''قدر زائد'' کے نظریہ کے مطابق، تو یہ بالکل اسی لوٹ کی بدلی ہوئی شکل ہے جو تمام سرمایہ دار ملکوں میں جاری ہے۔ یہ مارکسی نظریہ کی رو سے ایک نظام استحصال کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا نظام استحصال قائم کر دینا نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر جب اشتراکی ملکوں میں بھی محنت کی لوٹ کا بعینہٖ وہی عمل جاری ہے جو سرمایہ دار ممالک میں ہے تو آخر یہ معاشی خوشحالی آئی کہاں سے؟ کیا کمیونسٹ حضرات اس کی کوئی نظریاتی توجیہہ کر سکتے ہیں۔

اوپر جو حقیقت میں نے درج کی ہے اس کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ اشتراکیت معاشی اعتبار سے مغربی سرمایہ دارانہ نظام کی کاربن کاپی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ صرف عنوان بدل دیا گیا ہے۔ ساری مار دھاڑ کے بعد بھی وہ اس پیداواری نظام سے ایک انچ آگے نہیں بڑھے ہیں جو سرمایہ دار ملکوں میں پہلے سے جاری ہے؟

---

[1] سوویت لینڈ، ۱۵ جنوری ۱۹۵۷ء

یہ کہا جا سکتا ہے کہ روس میں کارخانوں وغیرہ سے جو منافع حاصل کیا جاتا ہے وہ کسی سرمایہ دار کی جیب میں نہیں جاتا بلکہ وہ حکومت کو ملتا ہے اور وہاں سے باقاعدہ منصوبہ کے تحت مختلف اجتماعی مقاصد میں صرف کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سرکاری ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں اس کے مطابق، سوویت روس میں کارخانوں سے حاصل شدہ منافع کی تقسیم کا اصول یہ ہے کہ پچاس فیصدی سرکاری خزانے میں داخل ہوتا ہے۔ ۱۰ر فیصدی مزدوروں اور کاریگروں کے آرام وفلاح کے لیے خرچ کیا جاتا ہے اور چالیس فیصدی کارخانوں کی ترقی وتوسیع پر صرف ہوتا ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ ٹھیک یہی نوعیت خود سرمایہ دار ممالک میں بھی قائم ہے۔ ان ملکوں میں سرمایہ دار اپنے کارخانوں سے جو منافع حاصل کرتا ہے وہ سب کا سب خود ہڑپ نہیں کر لیتا بلکہ اس میں سے بہت بڑا حصّہ ــــ بعض اوقات اس کا ۹۹ فیصدی حصہ ـــــ ٹیکس کے طور پر حکومت کو دے دیتا ہے۔ کچھ رقم کارخانہ کی توسیع وترقی میں لگاتا ہے اور اس کے بعد جو رقم بچتی ہے اس کو کچھ مزدوروں کے علاج، ان کے لیے کوارٹروں کی تعمیر، ان کے لیے روشنی، پانی، تعلیم اور تفریح، وغیرہ کے انتظام میں خرچ کرتا ہے۔ خود حکومت بھی وصول کردہ ٹیکس کا ایک حصہ مزدوروں کی فلاح وآرام کے لیے خرچ کرتی ہے اور آخر میں سرمایہ دار ایک رقم اپنے ذاتی اخراجات کے لیے لے لیتا ہے۔ جس طرح اشتراکی ممالک میں کارخانے سے غیر متعلق وزیروں اور عہدیداروں کو ان کے ذاتی اخراجات کے لیے کارخانہ کے منافع سے تنخواہ دی جاتی ہے۔ اسی طرح ملکیتی نظام میں سرمایہ دار اپنے ذاتی اخراجات کے لیے کارخانہ کے منافع میں سے ایک حصہ لیتا ہے۔ پھر دونوں نظاموں میں فرق کیا ہوا۔ جب حالات دونوں جگہ ایک ہیں تو نتائج آخر دو کس طرح ہو جائیں گے؟ مارکس نے ''قدر زائد'' کے ذریعہ افلاس اور امارت کے پیدا ہونے کی جو نظریاتی توجیہہ کی تھی، اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جائے تو روس میں بھی ویسے ہی معاشی حالات ہونے چاہئیں جو دوسرے سرمایہ دار ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ کیوں کہ روس میں بھی اسی طرح محنت کش طبقہ سے ''قدر زائد'' وصول کیا جاتا ہے جس طرح سرمایہ دار ملکوں میں وصول کیا جاتا ہے۔ مارکس نے قدر زائد کے نظریہ سے یہ ثابت کیا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں افلاس کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اگر اس نظریہ کو صحیح مانا جائے تو

روس میں نظریاتی طور پر خوشحالی کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر یہ حقیقت ہے کہ روس میں معاشی خوشحالی پائی جاتی ہے تو لازمی طور پر مارکس کے قدر زائد کے نظریہ کو غلط تسلیم کرنا پڑے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ماننا پڑے گا کہ پیداوار اور تقسیم کے سرمایہ دارانہ طریقے کے تحت بھی خوشحال معاشی نظام وجود میں آتا ہے۔ یعنی اس نظام کے تحت جو غیر اشتراکی ملکوں میں قائم ہے۔ روس میں اب تک جو کچھ حاصل کیا جا سکا ہے وہ روسی دستور کی دفعہ ۱۲ میں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے:

''سوویت یونین میں ہر شہری کے لیے جو کہ کام کر سکتا ہے، کام کرنا ایک ڈیوٹی ہے اور عزت کی چیز ہے۔ اس اصول کے مطابق کہ ''جو کام نہ کرے وہ کھانا بھی نہ کھائے۔''

سوویت یونین میں سوشلزم کا اصول رائج ہے۔ یعنی ''ہر شخص سے اس کی قابلیت کے مطابق، کام لیا جائے اور ہر ایک کو اس کے کام کے مطابق معاوضہ دیا جائے گا۔ اس حاصل کو طریق حصول کی اس بحث کے ساتھ ملا کر دیکھئے جس کی تفصیل ہم نے اوپر بیان کی ہے اور پھر فیصلہ کیجئے کیا یہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام سے ذرہ برابر مختلف چیز ہے؟

''سرمایہ دارانہ نظام میں آدمی اسی وقت کسی معاوضہ کا مستحق ہوتا ہے جب وہ کوئی کام کرے۔ کام نہ کرنے کی صورت میں اسے کچھ نہیں مل سکتا۔ ٹھیک یہی صورت حال مزدوروں کی جنت میں بھی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں آدمی اپنی استعدادِ کار کے مطابق معاوضہ کا مستحق ہوتا ہے۔ معمولی کارکن کو معمولی اجرت دی جاتی ہے اور اعلیٰ صلاحیت کے کارکن کو زیادہ اجرت اور آسانیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ٹھیک یہی صورتِ حال مزدوروں کی جنت میں بھی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کسی کارخانہ کی ساری آمدنی صرف اس کے کارکنوں کو نہیں دی جاتی، بلکہ منافع کے نام سے ایک کثیر رقم اس کے مالک اور منتظم وصول کرتے ہیں۔ ٹھیک یہی صورتِ حال مزدوروں کی جنت میں بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں یہ منافع نجی مالک وصول کرتے ہیں اور اشتراکی نظام میں حکومت کے عہدے دار۔''

پھر اشتراکی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام میں فرق کیا ہوا۔ جب اشتراکی ملکوں میں بھی مزدور کو اس کی پوری مزدوری نہیں دی جاتی بلکہ اس کی محنت کی کمائی کا ایک حصہ ''منافع'' کے نام سے مسلسل اسی طرح وصول کیا جارہا ہے جس طرح سرمایہ دار ممالک میں وصول کیا جاتا ہے تو یہ خوشحالی آخر آئی کہاں سے؟ جو صورت حال سرمایہ دار ملکوں میں افلاس پیدا کرتی ہے اور طبقاتی امتیاز کا سبب بنتی ہے، ٹھیک وہی صورتِ حال نام نہاد اشتراکی ملکوں میں خوشحالی اور بے طبقاتیت کا سبب کیسے بن گئی؟ ـــــ حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کی فردوس تو درکنار اشتراکی ملکوں نے ابھی ''سوشلزم'' کی منزل بھی عبور نہیں کی ہے۔ وہ ابھی تک سرمایہ داری کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں۔

□□□